پانچویں لڑکی

جذبات کو گرما دینے والی دس سچی اور سنسنی خیز کہانیاں

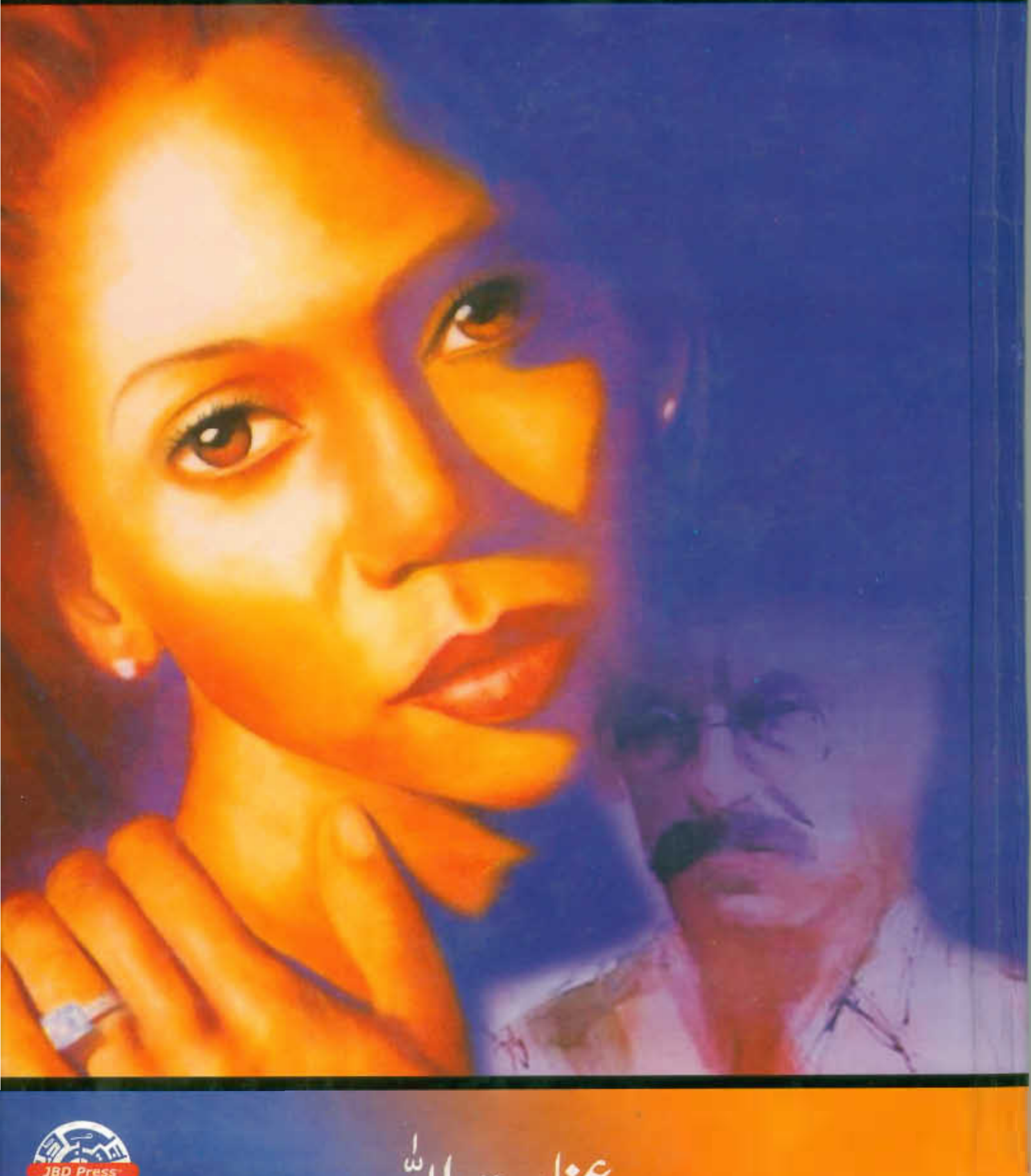

عنایت اللہ

JBD Press
JAHANGIR BOOK DEPOT URDU BAZAAR LAHORE

پانچویں لڑکی

جذبات کو گرما دینے والی دس سچی اور سنسنی خیز کہانیاں

ون اردو ڈاٹ کام

عنایت اللہ

جہانگیر بک ڈپو
لاہور، کراچی، راولپنڈی

فہرست

عجیب و غریب لڑکی راوی:۔ شیخ لال دین تحریر:۔ عرفان الحق ۷
...اور لڑکی مجھے غار سے نکال لائی راوی:۔ اورنگزیب خان تحریر:۔ اشفاق احمد ۳۳
جنگل کا بھیدی جنگل کی نذر ہو گیا لیونارڈ ہینڈے۔ ابن کمال ۵۷
ضمیر کی زنجیر ڈاکٹر ظہیر الدین ایم بی بی ایس ۷۹
تولیدو کا گناہگار انٹین چیخوف۔ رفیق احمد ۹۹
پانچویں لڑکی راوی:۔ خوش دل خان تحریر:۔ ہمت خان ۱۰۹
کالی بلی اور لیفٹیننٹ بیلے ریٹائرڈ صوبیدار محسن خان ۱۲۷
بب ڈوری کے شیر، مہارلجہ کے ڈوگرے نذر حسین بخاری ۱۴۷
مراکش کا مجاہد عبدالخالق ۱۶۷
بیوہ بیٹا اور بھید امان اللہ ۱۸۱

پیش لفظ

دس سچی کہانیوں کا یہ مجموعہ آپ کو دُنیا کے کئی رنگ دکھائے گا۔ یہ کہانیاں افسانے نہیں حقیقی واقعات اور وارداتیں ہیں جو ناقابلِ یقین تو نہیں پھر بھی بعض کہانیاں ایسی عجیب و غریب سی لگتی ہیں جن پر ذرا مشکل سے ہی یقین آتا ہے۔ اِنسانی فطرت گہرے سمندر کی مانند ہے جس میں نہ جانے کیا کچھ چھُپا ہُوا ہے۔ کوئی انسان کچھ کرنے پہ آجاتا ہے تو وہ ایسی انتہا تک پہنچ جاتا ہے کہ خود انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بعض انسانوں سے معجزے بھی کرا دیتی ہے۔

اِن کہانیوں میں آپ کچھ ایسی ہی معجزہ نُما کہانیاں پڑھیں گے۔ مثلاً ــــ ”اور لڑکی مجھے غار سے نکال لائی“ ــــ ایسی ہی ایک کہانی ہے۔

اِس مجموعے میں کچھ کہانیاں ایمان افروز اور ولولہ انگیز ہیں۔ اِنہیں آپ جنگِ آزادی کی کہانیاں کہہ سکتے ہیں مثلاً ــــ ”مراکش کا مجاہد“ ــــ اُس دور کے مجاہدین کی کہانی ہے جب مراکش بیک وقت دو مُلکوں کا غلام تھا۔ مراکش کے ایک حصّے پر سپین کا قبضہ تھا اور دوسرے پر فرانسیسیوں کا۔ مراکش کے مجاہدین نے بڑی لمبی جنگِ آزادی لڑ کر اپنے ملک کو آزاد کرایا تھا۔

”پانچویں لڑکی“ اُس دَور کی کہانی ہے جب پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صُوبے کے قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ تک پوری ایک صدی اپنے خطے کو آزاد رکھنے کے لئے لڑتے رہے۔

"بب ڈوری کے شبیر مہاراجہ کے ڈوگرے" مقبوضہ کشمیر کی سچی کہانی ہے۔ یہ کہانی بظاہر شکار کی کہانی ہے لیکن اس میں آپ کو آزادی کی وہ تڑپ ملے گی جو ہر کشمیری مسلمان کے سینے میں دبی ہوئی ہے۔

"ضمیر کی زنجیر" ایک ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر کی سنائی ہوئی سچی کہانی ہے۔ اس کہانی کو "حکایت" کے سالگرہ نمبر ۱۹۸۴ء میں انعام یافتہ قرار دیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو نفسیات بھی ملے گی اور ایک ایسا واقعہ بھی جو آپ کے جذبات میں زلزلے بپا کر دے گا۔

"عجیب و غریب لڑکی" بھی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ اسے بھی انعام یافتہ قرار دیا گیا تھا۔ باقی کہانیاں بھی آپ کو جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور انسانی فطرت کے تاریک غاروں اور بھول بھلیوں کی سیر کرائیں گی۔ ہر کہانی ایک لمبی مدت تک آپ کے ذہن میں گونجتی رہے گی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

عجیب و غریب لڑکی

تایا لالو اپنی عمر تو بہت زیادہ بتاتا ہے لیکن میرے حساب کے مطابق وہ اسی برس کے قریب ہوگا۔ ہم بچپن سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ یہ کس خاندان کا فرد ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ہر خاندان کا فرد سمجھتا ہے۔ جب اُس کے جسم میں کچھ طاقت تھی تو وہ محلّے کے ہر گھر کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کرتا تھا۔ ایک کام تو یہ ہوتا تھا کہ بعض گھروں میں مرد صبح سویرے اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ پیچھے عورتیں رہ جاتیں جو بازار سے سودا سلف نہیں لا سکتی تھیں۔ تایا لالو نے یہ کام اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر تایا لالو اپنے دروازے کے سامنے بیٹھ جاتا یا مسجد میں جا بیٹھتا۔

ہمارے قصبے میں ایک مسلم ہائی سکول تھا۔ میں نے اس سکول سے میٹرک پاس کیا اور چالیس میل دُور شہر میں چلا گیا جہاں کالج میں داخلہ لیا اور بی اے کر کے وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ میں جب عملی زندگی میں داخل ہوا تو حقیقتیں سامنے آئیں۔ تایا لالو اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں اور میرے دوست اُس کو ایک دلچسپ شخصیت ہی سمجھتے تھے لیکن اب ویسے ہی خیال آگیا کہ اس شخص نے اس قسم کی زندگی کیوں گزاری ہے۔ میں نے پہلی بار اپنی والدہ اور والد صاحب سے بھی اس شخص کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے مجھے تایا لالو کے بارے میں ادھوری سی باتیں بتائیں جو مجھے دلچسپ اور عجیب لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ تایا لالو کے ساتھ ہی بات کروں اور اگر اُس کی گزری ہوتی زندگی اور اُسے اس حال تک پہنچانے والے واقعات

سچے ہیں تو لکھوں اور جگ بیتی کے طور پر "حکایت" کے انعامی مقابلے کے لئے بھیجوں۔

تایا لالو کی کہانی برما کے شہر رنگون سے شروع ہوتی ہے۔ برما کے بارے میں مجھے اس کے سوا کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک ملک ہے۔ اتفاق سے میرے والد صاحب فوج میں صوبیدار تھے اور وہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما فرنٹ پہ اس جنگ میں شریک تھے۔ والد صاحب نے مجھے بتایا کہ دوسری جنگِ عظیم جو جرمنی نے شروع کی تھی اس میں جاپان بھی انگریزوں کے خلاف شریک ہو گیا۔ جاپان نے اچانک حملہ کر کے بحرالکاہل کے تمام بڑے بڑے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ جاپان اتنا آگے بڑھ آیا کہ آج کل جسے ہم انڈونیشیا اور ملائیشیا کہتے ہیں، ان سب پہ جاپان نے قبضہ کر لیا اور انگریزوں کی جتنی فوج تھی اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہاں سے جاپان آگے بڑھا اور پورے برما سے انگریزوں کی فوج کو بھگا کر برما پر بھی قابض ہو گیا۔ برما کا سب سے بڑا شہر رنگون تھا جو برما کی بندرگاہ ہے۔

میرے والد صاحب نے مجھے بتایا کہ رنگون میں تجارت زیادہ تر پنجابیوں کے ہاتھ میں تھی۔ بڑی بڑی دکانیں پنجابیوں کی تھیں۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگ تھے جو وہاں کاروبار کرتے تھے۔ تقریباً تمام ہوٹل مدراسیوں کے تھے۔ اس طرح برما کی دولت ہندوستان کے لوگوں کے پاس تھی۔ جب جاپان نے برما کی طرف پیش قدمی کی تو ہندوستان کے رہنے والے ان تمام تاجروں اور دکانداروں کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جاپانی بڑے ظالم فوجی ہیں جو لوگوں کے مال و دولت اور جوان لڑکیوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ والد صاحب نے یہ عجیب بات بتائی کہ برما کے باشندوں نے جاپانی فوج کا باقاعدہ استقبال کیا تھا۔ وہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انگریز تو وہاں سے بھاگ آتے تھے۔ جاپانیوں نے بڑے آرام سے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔

یہ فوجی معاملات ہیں۔ میں نے ان میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں لی اور آپ کو بھی اس میں دلچسپی نہیں ہو گی۔ میں کہانی اتنی ہی سناؤں گا جس کا تعلق تایا لالو کے ساتھ ہے۔ "حکایت" پڑھنے والوں کو ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ مشرقی پنجاب سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پاکستان کو ہجرت

کر کے آتے تھے۔ بے شک مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا اور اُن کے گھر لوٹے گئے اور اُن کی لڑکیوں کو اغوا کیا گیا لیکن ہجرت کا فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ نقشے پر رنگون شہر دیکھیں اور وہاں سے آسام اور بنگال کے فاصلے کا اندازہ کریں۔ یہ فاصلہ سینکڑوں میل ہے۔ اس راستے کی جو دشواریاں تھیں وہ میں آپ کو تایا لالو کی زبانی سناؤں گا۔

میں نے ایک روز جب میں پندرہ دن کی چھٹی لے کر گھر آیا ہوا تھا، تایا لالو کو اپنی بیٹھک میں بٹھا لیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تایا لالو چائے کا بہت شوقین ہے۔ میں نے اُسے چائے پلائی اور یہ بھی کہا کہ وہ جتنی بھی چائے پینا چاہتا ہے میں پلاتا رہوں گا اور اس کے عوض مجھے اپنی گزری ہوئی زندگی کی داستان سُنا دے۔ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کے چہرے کا رنگ اور تاثر ہی بدل گیا۔ اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں اور مجھے دیکھتا ہی رہا۔ پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

"تم نے میرا کام کر دیا ہے" — تایا لالو نے کہا — "نہ میرے پاس کوئی بیٹھتا ہے نہ میں کسی کے پاس بیٹھتا ہوں کہ جو مجھ پر گزری ہے وہ میں کسی کو سناؤں۔ میری کہانی کوئی بہادری کی کہانی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ میں سب کو سناؤں اور لوگ عبرت حاصل کریں۔"

اس طرح کچھ باتیں تمہید کے طور پر کر کے تایا لالو نے اپنی کہانی سنائی۔ یقین ریں کہ جب میں اُسے اپنی بیٹھک میں لایا تھا اُس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ ہم نے وہیں کھانا کھایا اور لالو کو میں نے پانی کی طرح چائے پلائی۔ اُس نے جو داستان سنائی وہ بہت ہی لمبی ہے کیونکہ اُس نے ہر واقعہ پوری تفصیل سے سنایا تھا۔ بوڑھا آدمی ویسے بھی بات کو لٹکاتا چلا جاتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ بات جلدی ختم نہ ہو۔ تایا لالو نے بھی میرے ساتھ یہی سلوک کیا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سارا پس منظر پوری طرح مجھ پہ واضح ہو گیا اور میں یہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُس کی ساری کہانی حرف بحرف سچی ہے۔ میں اتنی لمبی کہانی اپنے الفاظ میں سناؤں گا تاکہ آپ کا حال بھی وہ نہ ہو جاتے جو تایا لالو نے میرا

کر دیا تھا۔

تایا لالُو ہمارے محلّے میں درمیانہ درجے کے ایک گھر میں پیدا ہوا تھا۔ یہیں اُس نے دس جماعتیں پاس کی تھیں۔ اُس زمانے میں دس جماعتیں بھی آج کل کے ایم۔ اے جتنی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ تایا لالُو کا باپ منیاری کی دکان کرتا تھا۔ باپ نے اُسے بھی دکان پر بٹھا لیا۔ تین چار سال بعد اپنی برادری میں ہی اُس کی شادی ہو گئی۔ اُس کی بیوی خوبصورت نہیں تھی۔ تایا لالُو خود بھی کوئی خوبصورت آدمی نہیں تھا۔ ایک سال بعد اُس کی بچّی پیدا ہوئی۔ ہمارے قصبے کا ایک آدمی برما پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ برما پولیس میں زیادہ تر پنجابی اور پٹھان تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برما کے ڈاکو بہت مشہور تھے۔ انگریزوں کو شاید برمیوں پہ پورا بھروسہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے برما پولیس میں زیادہ تر پنجابیوں اور پٹھانوں کو رکھا۔

یہ ہیڈ کانسٹیبل ایک بار چھٹی پر آیا تو اُس کی ملاقات تایا لالُو سے ہوئی۔ اُس نے تایا لالُو کو بتایا کہ وہ رنگون آ جائے تو وہ بہت دولت کما سکتا ہے۔ تایا لالُو نے اپنے باپ کو بتایا۔ باپ کو بھی یہ بات اچھی لگی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں بتایا تھا کہ رنگون میں پورے پورے بازار پنجابیوں کے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی مدد امداد کرتے ہیں۔ باپ نے منیاری کا کچھ سامان اور کچھ رقم تایا لالُو کو دی اور ہیڈ کانسٹیبل کی جب چھٹی ختم ہوئی تو اُس کے ساتھ اُسے بھیج دیا۔ برما جانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ ملک تو الگ تھا لیکن وہاں بھی ہندوستان کی طرح انگریزوں کی بادشاہی تھی۔ بہرحال تایا لالُو وہاں پہنچ گیا۔

ہیڈ کانسٹیبل کی مدد سے اُسے وہاں کرائے پر دکان مل گئی۔ شروع شروع میں تایا لالُو کو گھر بہت یاد آیا اور کچھ مشکل پیش آئی کہ دکان کی آمدنی بالکل معمولی تھی۔ تقریباً ایک سال اُس نے مشکل کا گزارا۔ اس کے بعد دکان ایسی چلی کہ تایا لالُو کو گھر کی یاد بھی کم آنے لگی۔ اُس نے بڑے صاف لفظوں میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُس میں کوئی بُری عادت پیدا نہ ہوئی۔ وہ پیسے کو سنبھال کر رکھتا تھا۔ اس پیسے سے وہ دکان میں مال ڈالتا رہا اور ایک سال اور گزرا تو اُسے یہ دکان چھوٹی نظر آنے لگی۔ اُس نے اس سے بڑی

دکان کرائے پر لے لی۔

ان دو سالوں میں اُس نے گھر والوں کو کچھ نہ بھیجا۔ خط لکھتا رہا کہ آمدنی ٹھیک ہے اور وہ اس آمدنی سے کاروبار کو بڑھا رہا ہے۔ یہ دکان اچھی جگہ پر تھی اس لئے زیادہ مشہور ہو گئی۔ تایا لالُو اس میں اضافہ کرتا رہا حتیٰ کہ ایک سال اور گزرا تو اُس نے ایک سیلزمین رکھ لیا۔

رنگون بہت بڑا شہر تھا اور وہاں نئی طرز کی دکانیں تھیں۔ انگریز اور امیر کبیر آدمی اُن دکانوں پر جاتے تھے۔ تایا لالُو نے بھی دکان کو ماڈرن شکل دے دی اور ایک سیلزمین اور رکھ لیا۔ اب یہ منیاری کی دکان نہیں تھی بلکہ شہر کے بڑے جنرل سٹوروں جیسا جنرل سٹور بن گئی تھی۔ تایا لالُو نے گھر والوں کو پیسے بھیجنے کی بجائے یوں کیا کہ دس بارہ روز کے لئے گھر آیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لے گیا۔ اُس کی ابھی ایک ہی بچّی تھی وہ چار یا پانچ سال کی تھی۔ اُس وقت تک تایا لالُو اچھی قسم کے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ اُس کا لباس بھی بدل چکا تھا۔ وہ اب پاجامہ کُرتا یا شلوار قمیض نہیں پہنتا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے گیا تو اُس کے دوستوں نے اُسے اور اُس کی بیوی کو گھروں میں مدعو کیا۔ اس کے جواب میں تایا لالُو نے بھی اپنے دوستوں کو اُن کی بیویوں کے ساتھ اپنے گھر مدعو کیا۔ یہ خاص طور پہ ذہن میں رکھیں کہ اب وہ لالُو نہیں کہلاتا تھا بلکہ مسٹر لال کے نام سے مشہور تھا اور اُس کے جنرل سٹور پہ جو بورڈ لگا ہوا تھا، اس پہ اس کا نام لال ڈی شیخ تھا۔

یہاں سے اُس کا دماغ اُس راستے پہ چل پڑا جو لگتا تو بہت دلکش ہے لیکن سیدھا تباہی پر جا ختم ہوتا ہے۔ اُس کی سب سے پہلی زد اُس کی بیوی پر پڑی جو سیدھی سادی گھریلو سی عورت تھی۔ جسم بھی اُس کا ڈھیلا ڈھالا تھا اور وہ گھر میں نوکروں کی طرح کام کرتے رہنے کی عادی تھی۔ اُس زمانے میں ہمارا قصبہ جو آج ایک شہر بن گیا ہے، ایک بڑا گاؤں کہلاتا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی جگہ کی عورت ایڈوانس سوسائٹی میں نہیں چل سکتی۔ تایا لالُو پر خدا نے ایک کرم یہ بھی کر دیا کہ فوج سے بھی اُسے کچھ سپلائی آرڈر ملنے لگے۔ مثلاً پیتل کے بٹن، افسروں

کے عہدوں کے نشان جو پیتل کے بنے ہوتے تھے اور اس طرح کی ایک دو اور اشیاء۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں رشوت نہیں چلتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشوت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔ جہاں ہندوستانی بیٹھے ہوتے تھے اور جس کا داؤ لگتا تھا وہ چار پیسے فالتو کما لیتا تھا۔ تایا لالو کو آرڈر دینے والے دو ہندو تھے جنہوں نے اس سے ماہانہ وظیفہ لگوایا ہوا تھا اور وہ اسے باقاعدگی سے آرڈر دیتے رہتے تھے۔

تایا جب سپلائر بن گیا تو اس کا میل جول اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس قسم کی سوسائٹی میں شراب ضروری بھی جاتی تھی۔ اس سے تایا لالو بچ نہ سکا نہ اُس نے بچنے کی کوشش کی۔

شراب کی بدولت وہ سپلائر سے ملٹری کنٹریکٹر بن گیا۔ اس مقام پر آکر اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی بیوی نہ صرف بدصورت ہے بلکہ اجڈ بھی ہے۔ وہ خود بھی جسم کا ڈھیلا ڈھالا ہی ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ سمارٹ ہو گیا تھا۔ اُسے انگریزی بولنی بھی آگئی تھی چونکہ اُس کے پاس افسری سطح کے لوگ آتے تھے اس لئے اُس نے مکان بھی نئی طرز کا لے لیا تھا جس میں اُس نے جدید طرز کا فرنیچر رکھا۔ جب وہ اس مکان میں آیا جس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ خوشنما پردے لٹک رہے تھے تو اُسے اپنی بیوی پہلے سے زیادہ بدصورت اور اجڈ نظر آنے لگی۔ اُس نے مجھے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا کہ وہ چاہتا تھا کہ گھر میں جو نوکر اور نوکرانی ہو وہ بھی خوبصورت ہونی چاہیئے۔

پہلے تو وہ بیوی سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ پھر اُسے ایک بہانہ مل گیا اور وہ بیوی کو آکر چھوڑ گیا۔ بہانہ یہ ملا تھا کہ اُس کی ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ اُس کے ماں باپ نے ایسا مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ بیوی کو اُن کے پاس چھوڑ جاتے۔ اُس نے ظاہری طور پر برخورداری کا مظاہرہ کیا تھا کہ اکیلے گزارا کر لے گا اور بیوی کو ماں باپ کی خدمت کے لئے چھوڑ جائے گا۔ بیوی بے چاری نہ سمجھ سکی کہ وہ اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔

رنگون گئے ہوتے اُسے ساتواں سال تھا۔ اب وہ دوسری بیوی لانے کے چکر میں پڑ گیا۔ اُس نے بے شمار دولت اکٹھی کر لی تھی۔ بنک میں وہ اتنی زیادہ رقم نہیں رکھتا تھا تاکہ ٹیکس سے بچا رہے۔ زیادہ تر رقم گھر میں رکھتا تھا۔ پھر اُس نے سونے کے زیورات بنوانے شروع کر دیئے۔ اُس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ اُسے ماڈرن قسم کی لڑکی کا رشتہ دلا دیں۔ دوست لڑکیوں کو تلاش کرتے رہے۔ آخر اُس کی اپنی نظر ایک لڑکی پر پڑ گئی۔ وہ ایک پنجابی خاندان تھا جو کاروبار کے سلسلے میں وہاں آباد تھا۔ اُن کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی کبھی کبھار اُس کی دکان میں کچھ نہ کچھ خریدنے کے لئے آتی تھی۔ تایا لالو نے اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ لڑکی ایک حد تک اُس کے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔ تایا لالو نے اُسے بہت کم قیمت پر چیزیں دینی شروع کر دیں۔ ایک عید پر اُس نے لڑکی کو کوئی قیمتی چیز تحفے کے طور پر دی جو لڑکی نے قبول کر لی۔ اس سے تایا لالو کا حوصلہ بڑھ گیا اور اُس نے اُسی شام لڑکی کے باپ سے راہ و رسم پیدا کر لی۔

وہ کوئی امیر کبیر لوگ نہیں تھے۔ بس خوشحال گھرانہ تھا۔ اُن کے باقی بچے اس لڑکی سے چھوٹے تھے۔ لڑکی کا نام شبنم تھا۔ تایا لالو کے پاس دولت تھی اور دولت سپلائی کے آرڈروں اور ٹھیکوں کی صورت میں چلی ہی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تایا لالو خاصا چالاک اور زبان کا تیز طرار ہو گیا تھا۔ اُس نے کچھ زبان کے کمالات دکھائے اور باقی کام اُس کی دولت نے کیا اور شبنم کے ماں باپ اُس کے مرید بن گئے۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ اُس کے ہاتھ میں آگئے ہیں تو اُس نے شبنم کے رشتے کی بات کر دی، لیکن اُسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اُس نے جب بار بار رشتہ مانگا تو شبنم کے باپ نے اُسے بتایا کہ شبنم کی بات ایک جگہ تقریباً پکی کر دی گئی ہے۔ تایا لالو نے اُسے ہر طرح قائل کرنے کی کوشش کی کہ منگنی یا نکاح نہیں ہوا تو وہ اُن لوگوں کو جواب دے دیں۔

عورتیں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ تایا لالو نے شبنم کی ماں کو ہاتھ میں لے لیا اور اُسے سبز باغ دکھانے لگا۔ شبنم کی ماں نے اُسے بتایا کہ لڑکی نے اپنی پسند کا ایک آدمی دیکھ لیا ہے۔ وہ ہمیں ملا ہے اور وہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ ہم بیٹی

کی مرضی کے خلاف نہیں چلیں گے۔

"اگر میں آپ کی بیٹی کو منوا لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا"—— تایا لالو نے پوچھا۔

"ہاں"—— شبنم کی ماں نے جواب دیا —— "اگر شبنم کہہ دے کہ وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

تایا لالو کو پوری اُمید تھی کہ شبنم انکار نہیں کرے گی۔ اُس کی اُمید کی بنیاد دولت تھی۔ اُس نے جو قیمتی تحفے شبنم کو دیے تھے وہ سمجھتا تھا کہ یہ تحفے اُس کا دل اُس کی طرف کر دیں گے۔ اگلے روز وہ اپنے جنرل سٹور میں بیٹھا مکالمے سوچ رہا تھا جو وہ شبنم سے بولنا چاہتا تھا۔ اتنے میں شبنم آگئی۔ وہ بڑی تیزی سے اُٹھا اور کاؤنٹر سے پرے جا کر اس نے شبنم کا استقبال کیا۔ شبنم کے ہونٹوں پر روزمرہ جیسی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ اسے اُس چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جو تایا لالو نے اپنا دفتر بنایا ہوا تھا۔

"مسٹر لال!"—— شبنم نے اُسے بڑی سنجیدگی سے کہا —— "میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے پسند کیا ہے لیکن میں آپ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ آئندہ آپ میرے والدین کے ساتھ ایسی کوئی بات نہ کریں۔"

تایا لالو نے جو مکالمے سوچے ہوتے تھے وہ سب ذہن سے نکل گئے۔ اُس نے شبنم کو بٹھا لیا اور محبت کا اظہار کرنے لگا۔ شبنم نے بڑی شرافت سے اُسے ایک ہی جواب دیا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔

"میں کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کروں گا"—— تایا لالو نے جذباتی لہجے میں کہا —— "میں ساری عمر کنوارہ رہوں گا۔"

"آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"—— شبنم نے پوچھا۔

"اپنی پسند کی لڑکی کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں"—— تایا لالو نے جھوٹ بولا۔

"بہرحال مسٹر لال!"—— شبنم نے کہا —— "میں مجبور ہوں۔"

"آخر مجبوری کیا ہے؟"

"مجبوری یہ ہے کہ جس طرح آپ مجھے چاہتے ہیں اسی طرح میں کسی اور کو

چاہتی ہوں"—— شبنم نے جواب دیا —— "آپ حیران نہ ہوں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"میں حیران اس پر نہیں ہو رہا کہ آپ دل کے ہاتھوں مجبور ہیں"—— تایا لالو نے کہا —— "میں حیران اس پر ہوں کہ آپ کو والدین نے اتنی زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔ مسلمان عورت کو اتنی زیادہ آزادی نہیں ہونی چاہیئے۔"

"اور مسلمان کو جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہیئے"—— شبنم نے کہا —— "آپ کی بیوی موجود ہے جسے آپ نے اپنے وطن بھیج دیا ہے ...... باقی رہا آزادی کا معاملہ۔ کسی سے معلوم کر لیں، میرے پیچھے اپنے جاسوس لگا دیں۔ اگر میں ذرا سی بھی بداخلاقی کروں تو میں آپ کا ہر مطالبہ مان لوں گا۔ میں نے ایک آدمی کو پسند کیا ہے اور وہی میرا خاوند ہوگا۔"

"میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا"—— تایا لالو نے پینترا بدلا —— "میں تمہاری خاطر اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں۔"

"ابھی طلاق دی تو نہیں؟"

"نہیں"—— تایا لالو نے جواب دیا —— "تم مان جاؤ اور میں تحریری طلاق اپنی بیوی کو بھیج دوں گا۔ خدا کی قسم شبنم! تمہیں سونے میں تول کر رکھوں گا، شہزادی بنا دوں گا۔"

"اللہ مجھے معاف رکھے"—— شبنم نے کہا —— "میں کسی عورت کی آہ نہیں لینا چاہتی نہ میں اپنے آپ کو اتنا قیمتی سمجھتی ہوں کہ کوئی مجھے سونے میں تول کر لے جائے اور میں شہزادی بھی نہیں بننا چاہتی۔"

"اتنی دولت کو نہ ٹھکراؤ شبنم!"

"میں جسے چاہتی ہوں وہ معمولی سا آدمی ہے"—— شبنم نے کہا —— "اور یہی اُس کی خوبی ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو شبنم!"—— تایا لالو نے کہا —— "تم ابھی ناسمجھ ہو۔ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ آدمی معمولی ہے تو جذبات سے نکلو اور اس سے بچو۔ پچھتاؤ گی۔"

تایا لالو کے دماغ پر دولت کا بھوت سوار تھا۔ میرے آگے اُس نے اعتراف کیا کہ وہ خدا کو بھی بھول گیا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو ایک دولت مند آدمی کو ٹھکرا رہی ہے، لیکن لڑکی مسکرا رہی تھی جیسے تایا لالو کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ وہ جب جانے لگی تو تایا لالو نے اُسے کہا کہ وہ آتی رہا کرے۔ شبنم نے کہا کہ وہ ضرور آئے گی۔

اس کے بعد شبنم تین چار بار آئی۔ حسبِ معمول اُس نے کچھ نہ کچھ خریدا اور ہر بار تایا لالو نے اُسے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تحفے بھی پیش کئے جو شبنم نے یہ کہہ کر قبول نہ کئے کہ میں اپنی قیمت نہیں لینا چاہتی۔ تایا لالو اب بھی کہتا ہے کہ شبنم کو وہ عجیب و غریب لڑکی سمجھتا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ لڑکی نے صاف جواب دے دیا ہے اور لڑکی کے ماں باپ نے اپنے آپ کو لڑکی کے فیصلے کا پابند کیا ہوا ہے تو وہ لڑکی کو حاصل کرنے کے دوسرے طریقے سوچنے لگا۔ اُس نے ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ شبنم سے اُس نے اُس آدمی کا اتہ پتہ معلوم کر لیا جس سے شبنم شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ تایا لالو ایک روز اس آدمی سے جا ملا اور اسے کہا کہ وہ شبنم کے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔

وہ آدمی اس عجیب و غریب مطالبے پر حیران ہوا اور اُس نے تایا لالو سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کا شبنم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

"اُس کے ساتھ میرا وہی تعلق ہے جو تمہارا اُس کے ساتھ ہے" — تایا لالو نے اُسے کہا — "اگر تم خود ہی ایک طرف ہو جاؤ تو میں سمجھوں گا کہ تم عقلمند آدمی ہو۔"

"اگر میں ایسی عقلمندی نہ کروں تو؟" — اُس آدمی نے پوچھا۔

"پھر تمہارے ماں باپ کو بہت بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا" — تایا لالو نے اُسے دھمکی کے لہجے میں کہا۔

"آپ ایک آدھ دن انتظار کریں" — اُس آدمی نے کہا — "میں شبنم کے والدین اور شبنم کے ساتھ بات کر کے آپ کو جواب دوں گا۔"

"ایسی جرأت نہ کرو تو بہتر ہو گا۔"

"دیکھو مسٹر!" — اُس آدمی نے تایا لالو سے کہا — "میں اس سے بھی بڑی جرأت کر سکتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ میرے ساتھ سیدھی بات کریں اور دھمکیاں نہ دیں۔"

"پھر سیدھی بات سن لو" — تایا لالو نے کہا — "اگر دوستوں کی طرح میری بات مان لو گے تو پوری قیمت دوں گا۔ بولو کتنے ہزار چاہئیں ... اگر میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرو گے تو پھر شبنم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے اور شاید اپنی جان سے بھی۔"

"میں آپ کی قیمت پر تھوکتا ہوں" — اُس آدمی نے کہا — "پہلے آپ میری جان لیں۔ اس کے بعد شبنم شاید آپ کو مل جائے" — اور وہ آدمی تایا لالو کو وہیں کھڑا چھوڑ کر چلا گیا۔

تایا لالو تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ دولت سے شبنم کو بھی حاصل کر لے گا اور جسے وہ چاہتی ہے اُسے خوفزدہ بھی کر لے گا لیکن ایسے ہوا کہ اُسی شام شبنم اُس کی دکان میں آگئی۔

"مسٹر لالی!" — شبنم نے اُسے کہا — "اگر شجاع مر گیا تو بھی میں آپ کو اپنا خاوند نہیں بناؤں گی۔ آپ نے اُسے دھمکیاں دے کر اور اُسے میری قیمت پیش کر کے اچھا نہیں کیا۔"

"وہ میرا کیا بگاڑ لے گا؟" — تایا لالو نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — شبنم نے جواب دیا — "نہ وہ آپ کا کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ میں۔ میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ میں جو فیصلہ کر چکی ہوں اس سے ٹلوں گی نہیں۔ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ جھک مار رہے ہیں۔"

شبنم جس طرح غصے میں آئی تھی اُسی طرح غصے میں چلی گئی۔

دو تین روز بعد تایا لالو نے تین برمی غنڈے شجاع کو ڈرانے کے لئے بھیجے۔ اُنہوں نے شجاع کو کہیں راستے میں گھیر لیا اور چاقو نکال لئے۔ اُنہوں نے شجاع سے کہا کہ مسٹر لال ڈی شیخ نے اُسے جو کہا ہے اس پر وہ عمل کرے ورنہ اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اُنہوں نے اسے تین چار دنوں کی مہلت دی۔

ایک تو وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا جو تایا لالُو کو برما لایا تھا۔ وہ اب اے۔ ایس۔ آئی ہو چکا تھا اور اُس پولیس سٹیشن میں تھا جس کے علاقے میں برمیوں نے شجاع کو دھمکایا اور چاقو دکھاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ تایا لالُو نے تھانے کے بڑے تھانیدار کا مُنہ چند نوٹوں سے بند کر دیا تھا۔ اُس کے اے۔ ایس۔ آئی دوست نے اُسے بتایا کہ شجاع اور شبنم کا باپ تھانے میں یہ رپورٹ دینے آئے تھے کہ تین برمی غنڈوں نے تایا لالُو کی شہ پر شجاع پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ بڑے اور چھوٹے تھانیدار نے نہ صرف یہ کہ اُن کی رپورٹ درج نہ کی بلکہ انہیں ڈرا دھمکا کر تھانے سے نکال دیا۔

تایا لالُو شجاع سے ملا۔

"رپورٹ لکھوا آئے تھانے میں؟"—— اُس نے شجاع سے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے قتل کروا کے دیکھ لو"—— شجاع نے کہا —— "شبنم تمہیں پھر بھی نہیں ملے گی۔"

تایا لالُو خاموش رہا۔ اُسے امید تھی کہ شبنم اُس کے پاس آئے گی لیکن وہ نہ آئی۔ اس نے دو تین دن انتظار کیا۔ شبنم پھر بھی نہ آئی۔ تایا لالُو نے اب یہ بندوبست کیا کہ اپنے اے۔ ایس۔ آئی دوست کو استعمال کر کے بڑے تھانیدار سے یہ کام کروا لیا کہ اُس تھانیدار نے شبنم کے باپ کو تھانے بُلا کر کہا کہ وہ اپنی بیٹی مسٹر لال سے بیاہ دے۔ اگر وہ نہیں مانے گا تو اس پر جھوٹا مقدمہ بنا کر اُسے خراب کیا جائے گا۔

"میں آپ کو اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی کا رشتہ دوں گا"—— شبنم کے باپ نے کہا۔

شبنم کا باپ کوئی بڑا آدمی نہیں تھا نہ اُس کا کوئی اثر و رسوخ تھا۔ وہ ڈری ہوئی حالت میں تایا لالُو کے پاس آیا اور اُس کی منت سماجت کی کہ وہ اُسے اس طرح پریشان نہ کرے۔

"میں شبنم کے سوا کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کروں گا"—— تایا لالُو نے کہا —— "میں آپ سے بیٹی مفت نہیں لوں گا۔ آپ مانگیں مجھ سے، بہت زیادہ رقم دوں گا۔"

شبنم کے باپ کو یہ بات بہت بُری لگی۔ اُس نے تایا لالُو کو گھور کر دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ تایا لالُو نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کی بات مانے گا یا نہیں۔

"میں بھی اسی پنجاب کا رہنے والا ہوں"—— اُس نے کہا —— "پنجابی ہو یا کہیں اور کا رہنے والا مسلمان، کوئی غیرت مند باپ اپنی بیٹی بیچا نہیں کرتا۔"

"پھر سوچ لو"—— تایا لالُو نے کہا —— "قیمت نہ لو، ویسے ہی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو... تم نے میری پاور دیکھ لی ہے۔ تمہارے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ میرے ساتھ ٹکر لے سکو۔"

"لال دین!"—— شبنم کے باپ نے کہا —— "میرے پاس پیسہ تو نہیں میرے دل میں خدا کا نام ہے۔ تم پیسے کی پاور دکھا رہے ہو، خدا کی پاور سے ڈرو۔"

تایا لالُو ہنس پڑا۔ اُس نے مجھے یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ میں خدا کی پاور کو واقعی بھول گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ روپیہ پیسہ خدا نے دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا مجھ پر راضی ہے اور اُس نے مجھے ایسی طاقت دے دی ہے جو ہر کسی کو میرا غلام بنا سکتی ہے۔

شبنم کا باپ کوئی آخری جواب دیئے بغیر چلا گیا۔ تایا لالُو اُسے گھبراہٹ کی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہُوا تھا۔ اُس کا اے۔ ایس۔ آئی دوست اس معاملے میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔ تایا لالُو کے کہنے پر اُس نے دو تین روز بعد ایک بار پھر شبنم کے باپ کو جا تنگ کیا۔ پھر شجاع کو راہ چلتے پکڑ لیا اور اُسے تھانے لے گیا۔ وہاں جا کر اُسے کہا کہ وہ اُسے چوری کے الزام میں حوالات میں بند کر سکتا ہے اور چوری ثابت کر کے اُسے سال دو سال کی قید بھی دلا سکتا ہے۔ تایا لالُو نے اس طرح کی دو تین اور مثالیں دے کر مجھے سنایا کہ پولیس کے دباؤ سے اُس نے شبنم کے باپ اور شجاع کو اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ ایک روز دونوں اُس کے پاس آئے اور اُس کی بہت منتیں کیں کہ وہ اُن کا پیچھا چھوڑ دے۔

"میں تم سے کسی ناجائز چیز کا مطالبہ نہیں کر رہا"—— تایا لالُو نے انہیں کہا —— "اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو۔ یہ کوئی ناجائز کام نہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا لال!"—— شبنم کے باپ نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اس لئے نہیں ہوسکتا کہ تم شریف آدمی نہیں" ـــــ شبنم کے باپ نے جواب دیا ـــــ "میں اتنی پڑھی لکھی اور شائستہ بیٹی تم جیسے بداخلاق آدمی کے حوالے نہیں کروں گا۔"

"تم نے مجھے بداخلاق کہا ہے" ـــــ تایا لالو نے کہا ـــــ "اب میں تمہیں یہ بھی دکھادوں گا کہ میں تھوڑا سا نہیں بہت سارا بداخلاق ہوں۔"

"کیا کروگے تم؟" ـــــ شجاع نے پوچھا۔

"شبنم اغوا ہوجائے گی" ـــــ تایا لالو نے جواب دیا ـــــ "پھر مجھ سے شبنم کو واپس لینے آجانا۔"

شبنم کا باپ اور شجاع اس دھمکی کو برداشت نہ کرسکے اور وہ چلے گئے۔ تایا لالو نے صرف دھمکی نہیں دی تھی۔ وہ شبنم کو اغوا کرواسکتا تھا اور اُس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اسے اغوا کرائے گا۔ اُس نے اپنے دوست اے۔ ایس۔ آئی کے ساتھ بات کی۔ کرائے کے غنڈے اس کے اپنے ہاتھ میں بھی تھے۔ ان دونوں نے شبنم کو اغوا کرنے کا پروگرام طے کرلیا۔ اسے ایس آئی نے اُسے یہ بھی بتادیا کہ کتنی رقم خرچ ہوگی۔ تایا لالو نے اُس سے کہا کہ وہ اگلے روز رقم دے دے گا اور اگر زیادہ ضرورت ہوئی تو زیادہ دے گا۔

"جو کام روپے پیسے سے ہونے والا ہے وہ سمجھو ہوگیا" ـــــ تایا لالو نے اے ایس آئی سے کہا۔

اس کام میں کچھ دن لگ گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ دو ماہر غنڈے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اُن کے آنے پر یہ کام ہونا تھا، لیکن غنڈوں کے آنے سے پہلے جاپان کی فوج آگئی۔ جنگ عظیم کا دوسرا سال تھا۔ تایا لالو جنگ کی خبریں ریڈیو پر سنتا رہتا تھا لیکن یہ اُس کی دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ جنگ یورپ میں ہو رہی تھی۔ اچانک جنگ رنگون میں پہنچ گئی۔ تایا لالو نے مجھے بتایا کہ وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ برما کے باشندوں نے جنگ سے ڈرنے کی بجائے خوشیاں منائیں۔ وہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ جاپان کی فوجیں آرہی ہیں اور کل پرسوں تک رنگون میں داخل ہو جائیں گی۔

تایا لالو نے مجھے بڑی لمبی لمبی باتیں سنائیں۔ جاپانیوں کے برما میں داخلے کی اور جنگ کی باتیں تھیں جنہیں میں نے دلچسپی سے نہیں سنا اور یہ آپ کی بھی دلچسپی کی باتیں نہیں۔ دلچسپی والی بات یہ ہے کہ برمیوں نے رنگون میں اور برما کے دوسرے شہروں میں ہندوستانی تاجروں اور دکانداروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ سب ہندوستانی جو مال و دولت اپنے ساتھ لے کر نکل سکتے تھے وہاں سے لے کر بھاگ اُٹھے۔ اُن کے بیوی بچے بھی اُن کے ساتھ تھے۔ تایا لالو نے تین چار روز پہلے بنک سے رقم نکلوالی تھی۔ گھر میں اُس نے پہلے ہی بہت ساری رقم رکھی ہوئی تھی۔ زیورات بھی بنا کر گھر میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ ساری رقم اور زیورات اُس نے چمڑے کے بیگ میں ڈالے اور وہاں سے چل پڑا۔ یہاں سے وہ ہجرت شروع ہوگئی جس کا میں نے کہانی کے شروع میں کچھ ذکر کیا ہے۔ لوگوں نے ہندوستان کا رُخ کر لیا۔ کسی کے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ آگے آکر بعض لوگوں کو ٹٹو یا خچر انتہائی زیادہ اُجرت پر مل گئے تھے لیکن ان میں سے اکثر لوگ راستے میں لوٹے گئے تھے۔

تایا لالو کے ساتھ اُس کا دوست اے ایس آئی تھا اور پولیس کا ہی ایک اور آدمی بھی اُن کے ساتھ چل پڑا تھا۔ تایا لالو نے ان دونوں سے کہا کہ چلو اب شبنم کے گھر چلتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں کہ دیکھو میرے پاس کتنا مال ہے اور میں تمہیں بالکل خیریت سے ہندوستان پہنچا دوں گا۔ اے ایس آئی نے اُسے کہا کہ خود بھی مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔ وہاں تو نفسا نفسی کا عالم ہے۔ برمی غنڈے لوٹ مار میں لگے ہوئے تھے۔ جو اُن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اُسے وہ قتل کر دیتے تھے۔

تایا لالو چمڑے کا بیگ اپنے سینے سے لگاتے ان دو دوستوں کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ رنگون شہر سے تینوں خیریت سے نکل گئے اور جنگلوں میں داخل ہو گئے۔ تایا لالو نے راستے میں ہندوستانیوں کو جس حالت میں بھاگتے دیکھا اس سے اُس کو خدا یاد آگیا مگر خدا تایا لالو کو بھول چکا تھا۔ اُس کی سزا شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے ماؤں اور باپوں کو دیکھا جنہوں نے ایک ایک بچہ اٹھا رکھا تھا اور ایک ایک بچے کو پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ بوڑھوں کو دیکھا جو چل نہیں سکتے تھے لیکن چلنے پر مجبور تھے۔ جن کے ساتھ جوان لڑکیاں تھیں وہ تو دوڑ رہے تھے کہ برمی

غنڈوں سے بچ کر نکل جائیں۔ ایک ہجوم تھا جو جنگلوں میں بکھرتا جا رہا تھا۔

برما کے جنگل بڑے خطرناک جنگل تھے۔ ان میں درندے بھی تھے۔ سانپ اور بڑے بڑے بچھو بھی تھے اور ان جیسی ہی ایک خطرناک چیز اور بھی تھی۔ یہ تھا وہاں کا مچھر۔ کسی درندے سے چیرا پھاڑا جانا ملیریا میں مبتلا ہو کر جل جل کر مرنے سے زیادہ بہتر تھا۔ علاقہ پہاڑی تھا۔ وہاں سے گزرنا بہت ہی دشوار تھا۔ تایا لالو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی بیوی اور بچی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہ چونکہ ابھی تازہ دم تھا اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے اس لئے بڑے اطمینان سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے ابھی فاصلے کا اور راستے کی دشواریوں کا اندازہ نہیں کیا تھا۔

سفر کی پہلی رات آ گئی۔ جنگل میں پانی کی کمی نہیں تھی اور کھانے کو کوئی نہ کوئی جنگلی پھل مل جاتا تھا۔ وہ تینوں رات کو ایک جگہ رک کر سو گئے۔ رات کو تایا لالو نے دو تین چیخیں سنیں اور وہ جاگ اٹھا۔ کچھ اور آدمیوں کا شور بھی اسے سنائی دیا۔ اس نے چمڑے کے بیگ کو اپنے سینے سے لگا کر دونوں بازو اوپر رکھ دیئے۔ اس کے دوست بھی جاگ اٹھے۔ صاف بات تھی کہ برمی کسی مہاجر خاندان پر ٹوٹ پڑے تھے اور ان کی عورتوں کو گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔

سفر میں تین چار راتیں اور آئیں۔ جو دن سفر میں کٹے ان کی داستان بڑی لمبی ہے۔ بعض واقعات ایسے ہیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس راستے میں ایک نوزائیدہ بچے کو پڑا دیکھا جو رو رہا تھا۔ ماں باپ اسے پھینک گئے تھے۔ ان کے بچے زیادہ ہوں گے۔ اس نے بوڑھے آدمیوں کی لاشیں بھی دیکھیں۔ ان میں اور چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے جوان عورتوں کی برہنہ لاشیں بھی دیکھیں۔ کئی آدمیوں کی لاشیں دیکھیں جو خون سے لال تھیں۔

لوگ بکھر گئے تھے۔ وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ لالو نے ہوائی جہاز بھی دیکھے جو اسے معلوم نہیں تھا کہ کس کے ہیں۔ ایک جگہ جو بلند تھی لالو اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا رہا تھا، اس نے کچھ دور فوجی جاتے ہوئے دیکھے جو ہندوستانی معلوم ہوتے تھے۔ یہ برما سے بھاگی ہوئی ہندوستانی فوج تھی۔ تایا لالو کو بالکل معلوم نہیں

تھا کہ انہوں نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہے اور کتنا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس کی جسمانی حالت خاصی بگڑ چکی تھی۔ اب تو اس سے اچھی طرح چلا بھی نہیں جاتا تھا۔

ایک رات تینوں دوست ایک جگہ سو گئے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا جب تایا لالو کی آنکھ کھلی۔ وہ اکیلا پڑا تھا۔ اس کے دوست وہاں نہیں تھے۔ اس کا چمڑے کا بیگ بھی غائب تھا۔ وہ اچھل کر اٹھا اور ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ پھر اس نے اپنے دوستوں کو آوازیں دیں، لیکن نہ اسے دوست نظر آتے نہ اس کی پکار پر ان کا کوئی جواب سنائی دیا۔ اس کے دوست اس کی وہ ساری دولت جسے وہ پاور سمجھتا تھا اڑا لے گئے تھے۔ تایا لالو کو یک لخت ایسے لگا جیسے اس کے جسم کی طاقت ختم ہو گئی ہو۔ اس سے اچھی طرح چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ پھر بھی وہ قدم گھسیٹتا ہوا چلتا گیا۔ اس کے چلنے کا طریقہ یہ تھا کہ سو ڈیڑھ سو قدم چلتا تھا اور بیٹھ جاتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر پھر چل پڑتا تھا۔ اس کی بھوک اور پیاس بالکل ہی ختم ہو گئی۔

سورج اپنا سفر طے کرتا گیا اور تایا لالو اپنے سفر پر اپنے جسم کے بوجھ کو گھسیٹتا رہا۔ پھر ایک اور رات آ گئی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پھر لیٹ بھی گیا لیکن نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کبھی لیٹتا اور کبھی بیٹھ جاتا تھا۔ رات بڑی اذیت میں گزری۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رو پڑا اور پھر وہ دودھ پیتے بچے کی طرح بلبلانے لگا۔ صبح ہوتی تو چل پڑا۔

اس نے مجھے اپنے اس وقت کے تاثرات اس طرح بتائے کہ وہ سوچتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ اسے زمین اور آسمان، پہاڑ اور درخت اپنے دشمن نظر آ رہے تھے۔ چونکہ وہ کہیں رک نہیں سکتا تھا، اس لئے وہ چلنے پر مجبور تھا۔ اسے سمت کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ دو پہاڑیوں کے درمیان بڑی کھلی جگہ تھی۔ تایا لالو وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسے تھوڑی دور آگے دو لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ لاشیں اس کے لئے عجیب چیز نہیں تھیں۔ اس ہیبت ناک سفر میں وہ بے شمار لاشیں دیکھ چکا تھا۔ اب اسے کسی لاش سے ڈر نہیں آتا تھا۔ وہ ان لاشوں کے قریب پہنچا اور بے حسی کے عالم میں ان کے قریب سے گزرا۔ ویسے ہی اس نے لاشوں کی طرف دیکھا تو وہ رک گیا۔ وہ دونوں لاشوں کو پہچانتا تھا۔ ایک اس کے اے ایس آئی دوست کی تھی، اور ایک اس پولیس کانسٹیبل کی جو ان کا ہمسفر

تھا۔ تایا لالُو نے بڑی تیزی سے لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنا بیگ ڈھونڈ رہا تھا لیکن بیگ لاشوں کے ساتھ نہیں تھا۔

دونوں لاشوں کے کپڑے خون سے لال تھے۔ برمیوں نے یا جو کوئی بھی وہ تھے اُن سے بیگ چھیننے کے لئے انہیں خنجروں یا چاقوؤں جیسے ہتھیاروں سے مار ڈالا تھا۔ تایا لالُو نے اُس وقت بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بیگ اُس کے پاس ہوتا تو اُس کی لاش یہاں پڑی ہوتی اور لاش کو جنگلی درندے اور گِدھ وغیرہ کھا جاتے۔ البتہ اُسے کچھ اطمینان ہُوا کہ جنہوں نے اُس کی دولت چرائی تھی انہیں سزا مل گئی ہے۔

خدا نے ابھی تایا لالُو کو مزید امتحان میں ڈالنا تھا۔ وہاں سے بھی وہ چل پڑا۔ اب اُسے بڑا صاف نظر آنے لگا تھا کہ وہ راستے میں گر پڑے گا اور وہ اُس کی زندگی کا آخری وقت ہوگا۔ اُس کی داڑھی بڑھ آئی تھی اور حلیہ بُری طرح بگڑ گیا تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا کہ اُسے سر میں چکر سا محسوس ہُوا۔ پھر اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آیا اور گزر گیا۔ ایسا دو تین مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد ہُوا۔ پھر اُسے یہ یاد رہا کہ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ اُسے بالکل یاد نہیں کہ رات کس طرح آئی اور کس طرح گزر گئی۔ اُس کی جب آنکھ کھُلی یا یہ کہیں کہ وہ جب ہوش میں آیا تو اُسی درخت کے نیچے پڑا تھا۔ جسم کا سارا زور لگا کر وہ اُٹھ بیٹھا اور سرک کر درخت کے تنے کے ساتھ ہو گیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اُٹھ سکا۔ اُسے بھوک کا شدید احساس ہُوا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھے۔ شاید کھانے کو کچھ مل جاتے۔ وہاں درختوں کی بہتات تھی۔ جھاڑیاں بھی تھیں جن کے ساتھ جھاڑی بیر جیسا کوئی پھل لگا ہُوا تھا۔

اُسے کسی کی باتیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ایک گھوڑے کے قدموں کی آوازیں بھی تھیں۔ ان آوازوں نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُسے اب یہ خطرہ تو نہیں تھا کہ وہ لوٹا جائے گا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ اُس کے پاس سے جو گزرے گا اُس سے وہ کہے گا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو یا مجھے جان سے مار ڈالو۔ وہ اِسی سوچ میں گم تھا کہ گھوڑے کے قدموں کی اور کسی آدمی کے بولنے کی آوازیں اُس کے قریب پہنچ گئیں۔ اُس نے سر اُٹھایا اور دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا کہ وہ غشی کے عالم میں خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ خواب ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے دو انسان نظر آئے۔ ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ عورت خچر پر سوار تھی۔ وہ دونوں کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ عورت جو خچر پر سوار تھی شبنم تھی اور جو مرد ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ شجاع تھا۔ تایا لالُو کے جسم میں جو ذرا سی جان رہ گئی تھی وہ بھی نکل گئی۔ شجاع اُس کے ساتھ یہی سلوک کر سکتا تھا کہ اُسے انتقاماً قتل کر دے۔ وہ شجاع کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ اِس اذیت ناک سفر سے نجات مل جائے گی۔

وہ دونوں چلتے گئے۔ دونوں تایا لالُو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُسے شبنم کی آواز سنائی دی — "یہ تو وہ ہے۔ رُک جاؤ۔"

شجاع نے خچر کو روک لیا اور شبنم اُتر آئی۔

"تم لال ڈی شیخ ہو نا!" — شبنم نے اُس پر جھک کر پوچھا۔

تایا لالُو خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"وہی ہے" — شجاع نے کہا اور تایا لالُو سے پوچھنے لگا — "وہ روپیہ پیسہ اور پولیس کی یاری کام نہیں آئی؟"

تایا لالُو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ شجاع نے شبنم سے کہا، چلو چلیں۔

"نہیں شجاع!" — شبنم نے کہا — "اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔"

"کیا کرو گی اسے ساتھ لے جا کر؟" — شجاع نے کہا — "یہیں مرنے دو۔"

"شجاع!" — شبنم نے حیران ہو کر کہا — "یہ گناہ نہ کرو۔ اسے ہم یہیں چھوڑ گئے تو میرا ضمیر مجھے شرمسار کرے گا کہ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ تم جانتے ہو میں گناہ سے کتنا ڈرتی ہوں۔ ہم نے اسے نہ بچایا تو یہ قتل جیسا گناہ ہوگا۔"

تایا لالُو نے مجھ سے کہا کہ اُس نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ شبنم عجیب و غریب لڑکی ہے۔ لالُو اُسے آزاد اور آوارہ لڑکی سمجھتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ آزادی اور

آوارگی میں فرق ہے۔ اب جب اُس نے شبنم کی یہ بات سُنی تو اُس کی یہ رائے ہو گئی کہ یہ لڑکی اتنی زیادہ عجیب ہے کہ اسے نارمل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تایا لالُو شبنم کو اس لئے بھی نارمل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود بہت بڑا گناہگار تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی انسان، خصوصاً شبنم جیسی آزاد لڑکی اتنی بڑی نیکی بھی کر سکتی ہے۔

شجاع اور شبنم نے تایا لالُو کو گٹھڑی کی طرح اُٹھایا اور خچر کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ خچر کے ساتھ ایک تھیلا بندھا ہُوا تھا۔ شجاع نے اس تھیلے میں سے کوئی جنگلی پھل نکالا۔ تایا لالُو مجھے سمجھاتا رہا کہ وہ پھل کیسا تھا۔ چونکہ یہ پھل اُسی علاقے کا تھا اس لئے میں صرف یہ سمجھ سکا کہ یہ پپیتے کی قسم کا کوئی پھل تھا۔ شجاع نے پھل لالُو کو دیا۔ لالُو کے پیٹ میں جب یہ غذا گئی تو اُس کے جسم میں جان آنے لگی۔

میں نے تایا لالُو سے کہا کہ ان دونوں کے ساتھ اُس کی یہ ملاقات ایسے لگتی تھی جیسے یہ کہانی تایا لالُو نے خود گھڑی ہے۔ یہاں آکر مجھے کہانی فلمی کہانیوں جیسی لگی۔ تایا لالُو نے کہا کہ ایسی ملاقات عجیب بالکل نہیں تھی۔ سب ایک ہی سمت کو جا رہے تھے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ اختیار کیا تھا۔ کہیں ایک دوسرے کو جاننے والوں کی اچانک ملاقات ہو جانا ناممکن تھا۔

"عرفی بیٹا!" — تایا لالُو نے مجھے کہا — "یہ ممکن تھا یا نہیں یہ مت سوچو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ خدا نے مجھے کچھ سمجھانا تھا اور مجھے ابھی اور سزا دینی تھی۔"

تایا لالُو کے جسم میں جب جان آگئی تو اُسے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ یہ دونوں اسے انتقاماً ساتھ لے جا رہے ہیں اور آگے جا کر اسے مار ڈالیں گے یا کسی کھائی میں پھینک دیں گے جہاں وہ تڑپ تڑپ کر مرے گا۔ کچھ آگے جا کر چھوٹی سی ایک ندی آئی جس میں سے ان تینوں نے پانی پیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ وہ کس قدر پیاسا تھا۔ شجاع نے اُسے کہا کہ وہ خچر پر سوار ہو جائے۔ اُس نے انکار کر دیا اور شبنم کی طرف دیکھا۔ شبنم اُسے تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ شجاع نے بھی شبنم سے کہا کہ یہ اب چل سکتا ہے اس لئے شبنم خچر پر سوار ہو جائے۔

"ایک بات بتا دو" — تایا لالُو نے ان دونوں سے پوچھا — "تم دونوں میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟ اگر مجھ سے انتقام لینا ہے تو دیر نہ کرو۔"

"انتقام لینا ہوتا تو ہم دیر نہ کرتے" — شجاع نے کہا۔

"انتقام لینا ہوتا تو ہم تمہیں وہیں پڑا رہنے دیتے" — شبنم نے کہا — "لیکن میں اس خیال سے ڈر گئی کہ خدا سمجھے گا کہ میں نے انتقام لینے کی خاطر تمہیں نہیں اٹھایا۔ تم اتنا سمجھ لو کہ دولت اور پولیس سے اُوپر بھی ایک پاور ہے۔ تم اسے سمجھ جاؤ۔"

تایا لالُو حیران تھا کہ یہ دونوں تر و تازہ کس طرح ہیں اور انہیں خچر کہاں سے مل گیا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا تو اُنہوں نے بتایا کہ شجاع اور شبنم اپنے اپنے خاندانوں سے الگ تھلگ چلے تھے۔ دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ اُن کے والدین اور عزیز و اقارب کہاں ہیں۔ یہ اُن کی محبت کا کرشمہ تھا کہ مشکل وقت وہ اکٹھے ہو گئے۔ شجاع نے یہ خچر کسی سے تھوڑی سی دیر کے لئے لیا تھا کہ کچھ سامان کسی جگہ پہنچانا ہے۔ اس کے بعد خچر واپس کر دیا جائے گا۔ وہ خچر ساتھ لے کر وہاں سے بھاگ آئے۔ اتفاق سے انہوں نے راستہ ایسا اختیار کیا تھا جہاں وہ بیرمیوں سے محفوظ رہے اور علاقہ اتنا شاداب تھا کہ اُس جنگل نے انہیں بھوکا اور پیاسا نہ رہنے دیا۔

"یہ خدائی مدد ہے" — تایا لالُو نے انہیں کہا — "مجھ جیسوں کی خدا مدد نہیں کیا کرتا۔"

انہوں نے شبنم کو خچر پر سوار کیا اور چل پڑے۔ سفر کی ایک اور رات آئی۔ انہوں نے یہ رات اس طرح گزاری کہ شجاع اور شبنم گہری نیند سوتے رہے اور تایا لالُو اچھی طرح نہ سو سکا۔ ایک تو اُسے یہ دھڑکا لگا رہا کہ وہ دونوں اسے مار ڈالیں گے یا وہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے اور دوسرے اس وجہ سے بھی اُسے نیند نہ آئی کہ اپنے کئے پر وہ پچھتاتا رہا۔ اُس رات پہلی بار اُسے اپنی بیوی کا خیال آیا۔ ذہنی طور پر وہ اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ اُس کی بیوی کے خط اُسے ملے تھے۔ وہ اُسے لکھتی تھی کہ اُسے وہ رنگون بلا لے۔ اُس نے پہلے ایک دو خطوں کے جواب دیئے تھے۔ آخر اُس نے اپنی بیوی کو بڑا ہی بیہودہ خط لکھا تھا۔ اُس کی بیوی نے اُسے بچّی کا واسطہ بھی دیا تھا جس کا تایا لالُو پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہُوا تھا۔ اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ بیوی نے خط لکھنے چھوڑ دیئے اور تایا لالُو نے بیوی کو ذہن سے اتار دیا۔ اب تایا لالُو کو افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے بے گناہ بیوی پر ظلم کیا ہے۔ اور یہ اُس

کی آہوں کا اثر ہے جو اُسے سزا دے رہا ہے۔

صبح ہوئی۔ اُن کے پاس جو تھوڑا سا پھل بچ گیا تھا وہ کھایا اور چل پڑے۔ دو تین میل ہی چلے ہوں گے کہ اچانک تین آدمی جنہوں نے سروں پر برمیوں جیسے کپڑے لپیٹ رکھے تھے سامنے آ گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ گھات میں بیٹھے تھے۔ وہاں اُن کی مدد کو کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تایا لالُو کہتا ہے کہ وہ برمی نہیں تھے۔ وہ آسامی ہوں گے۔ برما تو اب پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید وہ اب آسام میں داخل ہو رہے تھے۔ اُن تینوں میں سے ایک نے اُنہیں کہا کہ خچر اور لڑکی ہمارے حوالے کر دو اور جاؤ۔ دو کے ہاتھوں میں خنجر اور ایک کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار تھی۔ شجاع اور تایا لالُو خالی ہاتھ تھے۔ شجاع نے اُن برمیوں یا آسامیوں سے کہا کہ جب تک وہ زندہ ہیں نہ وہ خچر دیں گے نہ لڑکی۔ اُن میں سے ایک جس کے ہاتھ میں خنجر تھا شجاع پر جھپٹ پڑا اور اُسے خنجر مارا جو اُس کے بازو پر لگا۔ خون پھوٹ پڑا۔

تایا لالُو اس قسم کی لڑائی سے واقف نہیں تھا۔ وہ کبھی لڑا نہیں تھا۔ اچانک اُس کے جسم میں پھرتی آ گئی۔ اُس نے شجاع پر حملہ کرنے والے کے پیٹ میں اتنی زور سے لات ماری کہ اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا اور اُس نے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ لئے اور وہ آگے کو جھک گیا۔ تایا لالُو نے جھپٹ کر خنجر اُٹھا لیا لیکن اتنی سی دیر میں شجاع کے ایک کندھے پر تلوار کا وار پڑ چکا تھا۔ اُن میں سے ایک نے شبنم کو بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ تایا لالُو نے پیچھے سے اتنی زور سے اُس کی پیٹھ میں خنجر مارا کہ آدھے سے زیادہ خنجر اُس کے جسم میں اُتر گیا۔ فوراً خنجر کھینچ کر اُس نے ایسا ہی ایک اور وار کیا۔ زیادہ خطرہ تلوار والے کا تھا۔ شجاع لے زخمی ہو جانے کے باوجود تایا لالُو کی طرح تلوار والے کے پیٹ میں لات ماری۔ اُس کی تلوار گر پڑی جو شجاع نے اُٹھا لی لیکن شجاع میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ وار کر سکتا۔ تایا لالُو نے اُسے بھی خنجر مارا جو اُسے زیادہ زخمی تو نہ کر سکا لیکن وہ اور دوسرا ساتھی اپنے تیسرے ساتھی کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

شجاع کے ہاتھ سے تایا لالُو لے تلوار لے لی اور اُسے دیکھا۔ اُس کا کندھا بُری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہنسلی کی ہڈی بھی کٹ گئی ہو۔ دوسری طرف بازو میں گہرا زخم تھا۔ ڈاکوؤں کا زخمی ساتھی مر چکا تھا۔ تایا لالُو کو فتح کا ایسا احساس ہُوا کہ ایک بار پھر اُس پر وہی نشہ طاری ہو گیا جو دولت کے نشے سے ملتا جُلتا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ وہ شجاع کو مرنے کے لئے وہیں چھوڑ دے اور شبنم کو ساتھ لے جائے۔ اب اُس کے پاس ہتھیار بھی تھا، خچر بھی تھا۔

شجاع نے بے بسی کی سی حالت میں تایا لالُو کی طرف دیکھا۔ شبنم دوڑ کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اُس وقت تایا لالُو نے دیکھا کہ شجاع کی ٹانگ بھی زخمی ہے اور وہ اچھی طرح چل نہیں سکتا۔ تایا لالُو نے جب شبنم کی یہ کیفیت دیکھی کہ وہ شجاع پر نثار ہوتی جا رہی ہے تو اُس کے ذہن میں یہ جو ارادہ آیا تھا کہ وہ شجاع کو وہیں پھینک دے، نکل گیا۔ غالب خیال یہ رہ گیا کہ ان دونوں نے اُس کی جان بچائی ہے۔

تایا لالُو نے اپنی قمیض اتاری، اُسے پھاڑا اور جتنے زخم تھے اتنے ہی پیڈ بنا کر شجاع کے زخموں پر رکھے اور شبنم کا دوپٹہ پھاڑ کر کس کر پٹیاں سی باندھ دیں۔ خون روکنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ دونوں نے مل کر اُسے اُٹھایا اور خچر پر بٹھا دیا۔ شبنم رو رہی تھی اور تایا لالُو اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے انہیں دو تین جھونپڑے سے نظر آئے۔ وہ اُس طرف چل پڑے۔ پٹیاں جو شجاع کے زخموں پہ باندھی گئی تھیں، وہ سرخ ہو گئی تھیں۔ خون رکا نہیں تھا۔ شجاع نے کہا کہ وہ جھونپڑے برمیوں کے نہیں ہو سکتے۔ وہ جس کسی کے بھی تھے انہیں وہاں جانا تھا، ورنہ شجاع کے بچنے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔

وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ برمیوں کے جھونپڑے نہیں۔ وہ بنگالی النسل کے کچھ لوگ تھے اور ظاہر ہے کہ وہ غریب لوگ تھے۔ انہوں لے ان کی بہت مدد کی۔

وہاں دو بوڑھے آدمی تھے۔ انہوں نے معلوم نہیں کیا کچھ جلا پکا کر زخموں پر رکھا۔ اُن پر کوئی سفوف سا چھڑکا اور پٹیاں باندھ دیں۔ اُن کے پاس چاول اور مچھلی تھی جو انہوں نے انہیں کھلائی۔ رات شجاع نے سکون سے گزاری۔ اُس کا خون بند ہو چکا تھا۔

صبح تک شجاع کے چہرے پہ صحت کے آثار نظر آنے لگے۔ اُن لوگوں نے

انہیں ناریل کا پانی پلایا اور پپیتے جیسا کوئی پھل انہیں کھلاتے رہے۔ تین چار دنوں میں شجاع اور بہتر ہو گیا۔ چوتھی یا پانچویں شام تھی۔ تایا لالُو جھونپڑے کے اندر سو گیا تھا۔ اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ شجاع اور شبنم وہاں نہیں تھے۔ وہ باہر نکلا اور جھونپڑیوں سے کچھ دور چلا گیا۔ وہ سرسبز جگہ تھی۔ اُس نے دیکھا کہ شبنم اور شجاع درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہیں۔ اس کی طرف اُن کی پیٹھ تھی۔ شبنم نے اپنا بازو شجاع کے گلے میں ڈال رکھا تھا اور شجاع کا بازو شبنم کی کمر میں تھا۔ تایا لالُو کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے چل پڑا لیکن وہ جھونپڑوں کی طرف نہ گیا۔ کچھ دُور آگے زمین نیچے چلی جاتی تھی۔ وہ اُدھر اُتر گیا۔ اُسے تسلی تھی کہ شجاع محفوظ ہے اور اُس کے زخم اتنے بہتر ہو گئے ہیں کہ وہ آسانی سے چل پھر سکتا ہے۔ اُن کے پاس خنجر بھی تھا۔

وہ چلتا چلا گیا۔ اور جب وہ ایک آبادی میں داخل ہوا تو اُسے پتہ چلا کہ یہ آسام ہے۔ وہاں سے تایا لالُو کا ایک اور سفر شروع ہوا۔ وہاں سے وہ کسی طرح آسام کے بڑے شہر شیلانگ میں پہنچا۔ دو تین مہینے وہاں محنت مزدوری کی۔ وہاں سے بنگال میں آیا اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر جو کام اُسے ملا وہ کرتا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کا من مارا گیا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے اس سفر کی بڑی لمبی تفصیل سنائی تھی۔ وہ تو پوری کتاب کی کہانی ہے جو مختصراً اس طرح ہے کہ وہ جہاں بھی محنت مزدوری کرتا تھا وہاں کوئی مسجد دیکھ لیتا اور راتیں مسجد میں گزارتا تھا۔ نمازیں پڑھتا تھا اور مسجد میں جھاڑو دیتا تھا۔

اس طرح تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد وہ اپنے شہر میں واپس آ گیا۔ گھر والے اُسے رو پیٹ چکے تھے کہ وہ مر گیا ہے۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی۔ باپ مر گیا تھا۔ دکان اُس کے ایک بھائی نے سنبھالی ہوئی تھی۔ تایا لالُو کو دیکھ کر اُس کے گھر والوں نے خوشیاں منائیں لیکن تایا لالُو بالکل ہی بدل گیا تھا۔ گھر پہنچنے تک وہ محنت مزدوری کرتا رہا تھا لیکن گھر آ کر اُسے اس طرح لگا جیسے وہ کسی کام کے قابل رہا ہی نہیں۔ اُس کے بھائی نے کہا کہ اُس کی طبیعت چاہتی ہے تو دکان پر آ جایا کرے ورنہ گھر پر رہے۔

تایا لالُو کی بیٹی زندہ تھی (وہ اب بھی زندہ ہے) اُسے اُس کے ایک ماموں نے پالا پوسا تھا۔ ایک روز گلی میں وہ تایا لالُو کے سامنے آ گئی۔ اُسے پہلے دُور سے کسی نے بیٹی دکھائی اور کہا تھا، وہ ہے تمہاری بیٹی۔ اب اُس کی بیٹی دس گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ تایا لالُو نے اُسے پیار سے اُٹھانا چاہا تو بچی پرے ہٹ گئی۔

"میں تمہارا باپ ہوں!" — تایا لالُو نے کہا۔

"تم میری ماں کے قاتل ہو" — بچی نے کہا اور باپ کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

تایا لالُو کے لئے یہ بہت بڑی چوٹ تھی کہا جا سکتا ہے کہ تایا لالُو کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کے بعد آج تک تایا لالُو کی زندگی اس طرح گزری کہ ہر کسی کے ساتھ پیار سے بولتا ہے۔ ہر کسی کا کام کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ خدا کو یاد کرتا ہے۔ مسجدوں میں جھاڑو دیتا ہے اور چپ چاپ رہتا ہے۔

* *

....اور لڑکی مجھے غار سے نکال لائی

جن لوگوں نے جنگل نہیں دیکھے وہ سمجھتے ہیں کہ جنگل میں درندے، پرندے اور جنگلی جانور ہوتے ہیں اور وہاں لوگ شکار کھیلنے کے لیے جاتے ہیں یا وہ یہ جانتے ہیں کہ وہاں آدم خور شیر ہوتے ہیں۔ جنگل میں صرف یہی نہیں ہوتا جو آپ پڑھتے یا سنتے رہتے ہیں۔ جنگل میں عجیب و غریب بھید چھپے ہوتے ہیں جن سے صرف وہ لوگ واقف ہیں جو کسی جنگل میں کام کرتے ہیں۔ میں جب انڈیا سے پاکستان میں آیا تھا اُس وقت میری عمر چھیالیس سال تھی۔ ان چھیالیس سالوں میں، میں نے چھبیس سال نینی تال کے جنگلوں میں نوکری کی ہے۔ وہاں شیر، چیتے، ریچھ، بھیڑیئے، لکڑبگے بہت ہوتے تھے اور دوسرے جانوروں میں سامبر، چیتل اور ہرن بھی تھے۔ خرگوش اور سیہہ بھی پائے جاتے تھے۔ جنگل کے اس علاقے میں جہاں میری ڈیوٹی تھی ایک ندی گزرتی تھی جو ایک پہاڑی کے قریب آکر جھیل بن جاتی تھی۔ پانی جمع ہو کر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے تین طرف دیواروں کی طرح پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس جھیل میں چھوٹے مگرمچھ ہوتے تھے۔ ہر ایک درندے اور جانور کے شکار کی اجازت تھی۔ صرف مگرمچھ ایسا جانور تھا جس کے شکار کی اجازت نہیں تھی۔

ان درندوں میں ایسے انسان بھی تھے جو درندوں سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ جنگل کے مجرم تھے۔ شکاری جو اس جنگل میں آتے تھے، لائسنس لے کر آتے تھے اور یوں نہیں ہوتا تھا کہ وہ جتنے درندے یا جانور مارنا چاہیں مار لیں۔ ہر شکاری کو باقاعدہ پرمٹ ملتا تھا کہ وہ کون سے جانور کتنی تعداد میں مار سکتا ہے مثلاً ایک

ون اردو ڈاٹ کام

شیر اور دو ہرن یا ایک چیتا وغیرہ۔ ایک سے زیادہ شیر مارنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ قانون کی پابندی کرانے کے لئے جنگل کا سرکاری محکمہ تھا اور جنگل کی چوکیداری کے لئے بہت نفری تھی۔ میں اسی نفری میں تھا۔ وہاں جنگل کے جو مجرم تھے وہ طرح طرح کی چوریاں کرتے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ درخت کاٹ کر لے جاتے تھے اور دوسرا جرم جو کبھی کبھی دیکھنے میں آتا تھا یہ تھا کہ یہ لوگ شیروں، چیتوں اور ہرنوں کو پھندوں میں پھانستے تھے یا زہریلی غذائیں پھینک کر انہیں مارنے کی کوشش کرتے تھے، پھر ان کے مُردار اُٹھا لے جاتے اور ان کی کھالیں اُتار کر شہروں میں بیچتے تھے۔ انگریز اور راجے مہاراجے منہ مانگی قیمت دیتے تھے۔ ان چوریوں کے علاوہ جنگل میں ڈاکو آکر چھپا کرتے اور اغوا کی ہوتی عورتوں کو بھی چھپایا کرتے تھے۔ وہاں انہیں پکڑنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

میں آپ کو جو کہانی سنانے لگا ہوں یہ ایسے ہی جنگل چوروں کی ایک واردات ہے۔ اُس وقت میں جوان تھا۔ جنگل کی نوکری کا شاید چھٹا سال تھا۔ میں جنگل سے اور اس کے خطروں سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ مجھے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ جنگل کے چور شیروں وغیرہ کو زہر بھی دے دیتے ہیں۔ ایک روز ایک انگریز کپتان شکار کے لئے آیا۔ مجھے اُس کے ساتھ بھیجا گیا۔ وہ درخت پر مچان بندھوا کر شیر مارنا چاہتا تھا۔ تمام انتظامات کر دیئے گئے۔ دن کے پچھلے پہر ہم اُسے مچان تک چھوڑنے کے لئے گئے۔ اچانک میری نظر ایک درخت کے نیچے پڑی۔ مجھے تنے کی دوسری طرف ایک دھاری دار شیر (ٹائیگر) کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ اس کی دُم آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ اچھا ہُوا کہ میں نے دیکھ لیا۔ فاصلہ مشکل سے بیس گز ہو گا۔ میں نے کپتان کو روک لیا اور اشارے سے اُسے شیر دکھایا۔ اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور بیٹھ کر آگے سرکنے لگا لیکن شیر اُٹھ کھڑا ہُوا اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ وہ تنے کی اوٹ سے سامنے آ گیا۔ تھوڑے سے قدم چل کر رُک گیا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا۔ کپتان نے رائفل کندھے سے لگا لی مگر جلد ہی اس نے رائفل کندھے سے ہٹا لی اور شیر کو دیکھنے لگا۔ میں بھی حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شیر اتنی مہلت نہیں دیا کرتا۔ وہ حملہ

کرتا ہے یا بجلی کی چمک کی طرح غائب ہو جاتا ہے لیکن وہ کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر چل پڑا لیکن اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

شیر پھر رُک گیا۔ کپتان اسے دیکھتا رہا۔ شیر نے زور سے ابکائی لی۔ اس کا سر نیچے کو ہو گیا۔ ٹانگیں دوہری ہو گئیں اور وہ ایک پہلو پر گر پڑا۔ کپتان نے دو چار منٹ انتظار کیا۔ جب دیکھا کہ شیر نے کوئی حرکت نہیں کی تو آگے چلا گیا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ شیر مر چکا تھا۔ کپتان تجربہ کار تھا۔ اس لئے مجھے کہا کہ ایک آدمی کو یہاں کسی جھاڑی میں چھپا دیا جائے اور باقی سب واپس چلیں میں نے گوبل نام کے ایک ملازم کو وہاں رہنے کو کہا۔ کپتان نے اُسے اُردو زبان میں سمجھایا کہ وہ جھاڑی میں چھپ کر شیر کو دیکھتا رہے۔ اگر کوئی آدمی شیر کی کھال اُتارنے آئے تو اُسے پکڑنے کی کوشش کرے اور اگر وہ زیادہ ہوں تو اُن کا پیچھا کر کے دیکھے کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ کپتان نے یہ بھی کہا کہ رات سے پہلے کھال اُتارنے کوئی نہیں آئے گا۔ شیر کو کھال چوروں نے زہریلا گوشت کھلایا ہے۔ وہ رات کے وقت اس کی کھال اُتارنے آئیں گے۔

ہم سب کپتان کے ساتھ واپس آ گئے۔ اُس نے ہمارے افسر کو بتایا کہ جنگل میں کوئی کھال چور آ گیا ہے۔ مجھے آٹھ دس آدمی دو جن کے پاس رائفلیں ہوں تو اچھا ہے، ورنہ برچھیوں سے مسلح ہوں۔ اسے آدمی دے دیئے گئے۔ وہ شیر کے ارد گرد ان آدمیوں کو چھپا کر کھال چوروں کو پکڑنا چاہتا تھا۔ ہمارا صاحب بھی ساتھ چل پڑا۔ وہ تمام آدمیوں کو بتاتا جا رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ جب ہم شیر کی جگہ پہنچے تو ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں شیر پڑا تھا مگر اس کی کھال اور سر غائب تھا۔ میں نے گوبل کو آوازیں دیں۔ اُسے ہم جھاڑی میں چھپا آئے تھے۔ اُس کا کوئی جواب نہ ملا۔ اُس جھاڑی کی طرف گئے جہاں وہ چھپا ہُوا تھا۔ وہ ہمیں مل گیا لیکن مرا ہُوا۔ اس کی پیٹھ میں خنجر یا چاقو کے دو گہرے زخم تھے اور ایک وار دل پر تھا۔ اُس کی لاش خون سے لال ہو گئی تھی۔ ہم جنگل کے جتنے ملازم تھے سب پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ کسی جن یا بھوت پریت کی کارروائی معلوم ہوتی تھی۔ شیر کے مُردار کو فوراً زمین میں دبا

دیا گیا تاکہ اس کا زہریلا گوشت کوئی دوسرا شیر نہ کھا لے۔

اگر شیر کی کھال نہ اتاری جاتی اور ہمارا آدمی نہ مارا جاتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ شیر کو کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے یا وہ کسی بیماری سے مر گیا ہے۔ یہ کھال چوروں کا کام تھا۔ صاحب نے حکم دیا کہ تمام جنگل میں گشت کا انتظام کیا جائے اور دو آدمی رائفلیں لے کر ہر وقت گشت پر رہیں۔ علاقے تقسیم کر کے پہرے مقرر کر دیئے گئے۔ پرانے ملازم بتاتے تھے کہ ان کی یاد میں ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت عرصہ پہلے پھندوں میں جانور پھنسانے اور کھالیں اتارنے کی تین وارداتیں ہوئی تھیں۔ یہ پہلی بار تھی کہ شیر کو زہر دیا گیا اور اس کے ساتھ ایک آدمی بھی مارا گیا۔

کپتان شکار کھیلے بغیر چلا گیا کیونکہ اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ ہم نے جنگل کا پہرہ شروع کر دیا۔ پہرہ صرف دن کے وقت ہوتا تھا۔ رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ درندے رات کے وقت شکار کے لئے نکلتے تھے۔ تین دن بہت سارے آدمی جنگل میں گشت کرتے رہے۔ چوتھے دن کا واقعہ ہے کہ میں اکیلا جنگل میں گیا۔ مجھے حکم ملا تھا کہ میں جا کر دیکھوں کہ پہرے والے کہیں بیٹھ تو نہیں جاتے۔ میں ٹٹو پر سوار تھا اور میرے پاس سرکاری بندوق تھی۔ میں بہت دور چلا گیا جہاں جنگل زیادہ گھنا تھا اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی تھیں۔ وہاں ایک پتھریلا ٹیلا تھا۔ جنگل میں دور تک دیکھنے کے لئے ٹٹو کو ٹیلے پر چڑھا لے گیا۔ وہاں سے مجھے ایک ندی نظر آئی۔ تقریباً دو سو گز دور ایک جوان لڑکی درختوں میں سے نکل کر ندی پر گئی۔ وہ جنگل کے کسی ملازم کی بیٹی نہیں تھی نہ ہی جنگل میں کام کرنے والے کسی مزدور کی بیٹی تھی۔ اس نے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور دور سے وہ بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔

ایسی لڑکی کبھی جنگل میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ کوئی ایسی شکاری پارٹی بھی نہیں آئی تھی جس کے ساتھ لڑکی ہو۔ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ کسی مری ہوئی لڑکی کی بدروح یا عورت کے روپ میں آئی ہوئی چڑیل لگتی تھی۔

لڑکی نے سارے کپڑے اتار دیئے اور بالکل ننگی ہو کر ندی میں اتر گئی۔ اس کا جسم گورے رنگ کا تھا۔ پانی اس کے گھٹنوں تک تھا۔ وہ پانی میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ وہ اکیلی تھی۔ کوئی اور عورت یا مرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت نہیں۔ یہ ابھی غائب ہو جائے گی یا مچھلی بن کر ندی میں گم ہو جائے گی۔ جنگل کے اس حصے کے متعلق بہت سی ایسی باتیں مشہور تھیں کہ یہاں بدروحیں اور جن رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے جنگل کا کوئی ملازم اس طرف نہیں جاتا تھا۔ میری ملازمت سے پہلے سنا تھا کہ اس حصے میں تین چار لاشیں ملی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کس طرح مرے تھے۔ انہیں درندوں نے نہیں مارا تھا۔ میں ایسی ہی باتیں سن سن کر ڈرا ہوا تھا، اس لئے آگے جانے کی بجائے میں ٹیلے پر چڑھ گیا تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو دیکھا تو لوگوں کی باتیں سچ معلوم ہونے لگیں۔ میں نے ٹٹو کی باگ کھینچ کر موڑ لیا اور ٹیلے سے اتر آیا۔ اس وقت میں جوان تھا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں طاقت اور خون میں جوش تھا۔ بے شک میں جنوں سے نہیں لڑ سکتا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ بزدلوں کی طرح بھاگنا نہیں چاہیئے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ لڑکی کس طرح غائب ہوتی ہے اور کون سا روپ دھارتی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے ٹٹو کو ٹیلے کی دوسری طرف موڑ لیا جس طرف سے ندی گزرتی تھی۔ آگے گیا جہاں ندی کا موڑ تھا۔ وہاں سے مجھے درختوں میں سے وہ جگہ اچھی طرح نظر آ رہی تھی جہاں لڑکی نہا رہی تھی۔ ٹیلے سے اترنے اور ندی کے موڑ پر پہنچنے تک تھوڑی دیر لگ گئی تھی۔ مجھے وہ جگہ تو اچھی طرح نظر آ رہی تھی لیکن لڑکی غائب تھی۔ میں درختوں میں سے اسے نظروں سے ڈھونڈنے لگا۔ مجھے وہ جگہ یاد تھی جہاں لڑکی نے کپڑے اتارے تھے۔ میں اس جگہ کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ہرن وہاں ظاہر ہوا۔ بہت خوبصورت ہرن تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ندی تک گیا۔ پانی پیا اور ہٹ کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرن وہی لڑکی ہے اور اصل میں یہ جن ہے۔ میں نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا اور وہاں سے ٹٹو کو گھما لیا۔ ٹٹو

آٹھ دس قدم چلا ہوگا کہ تقریباً پچاس گز سامنے ایک ریچھ کھڑا دیکھا۔ بہت بڑا ریچھ تھا۔ ریچھ اتنا دلیر نہیں ہوتا کہ انسان کو دیکھ کر کھڑا رہے۔ بھاگ جاتا ہے لیکن یہ ریچھ میرا راستہ روک کر کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے وہ میرا راستہ روک رہا ہے۔ میں نے ٹٹو روک لیا۔ میرے دل میں یہی ڈر بیٹھ گیا کہ یہ وہی جنّ یا بد روح ہے جو پہلے لڑکی بنا پھر ہرن بنا اور اب ریچھ کی شکل میں سامنے آگیا ہے۔ میرے پاس دو نالی بندوق تھی لیکن میں دو وجہ سے بندوق نہیں چلا سکتا تھا۔ ایک یہ تھی کہ ہمیں درندے مارنے کی اجازت نہیں تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ریچھ دراصل جنّ یا بد روح تھا۔ اس پر گولی چلا کر میں خود نہیں مرنا چاہتا تھا۔

میں نے ٹٹو کو موڑ لیا اور دوسرے راستے پر چل پڑا۔ ریچھ وہاں سے چلا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ میں نے ٹٹو روک لیا اور ریچھ کو جنّ سمجھتے ہوئے بلند آواز سے کہا — "میں غلطی سے ادھر آگیا ہوں۔ میں نے تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ میری غلطی معاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔"

ریچھ وہیں کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ اس وقت تک ٹٹو ریچھ سے نہیں ڈرا تھا۔ اچانک ریچھ نے مُنہ سے عجیب سی آواز نکالی اور وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد بہت اُونچا تھا۔ اگر وہ اصل میں ریچھ ہی ہوتا اور مجھے اس پر گولی چلانے کی اجازت ہوتی تو میں اسے فوراً مار لیتا۔ اس نے اپنا سینہ پورے کا پورا آگے کر دیا تھا مگر میں مجبور تھا۔ ٹٹو نے ریچھ کی آواز سُنی اور اسے کھڑا ہوتے دیکھا تو بدک کر پیچھے کو مڑا اور دوڑ پڑا۔ جانور درندوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ٹٹو بھاگا تو میرے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ ریچھ یا وہ جو کچھ بھی ہے میرے پیچھے آکر مجھے اور ٹٹو کو مار ڈالے گا۔ میں نے ٹٹو کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مُنہ زور ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی باگیں کھینچیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہُوا اور وہ ایک غلط طرف مڑ گیا۔ درختوں کی ٹہنیاں میرے مُنہ کو لگ رہی تھیں۔ میں مضبوطی سے بیٹھا رہا۔ ٹٹو نہایت ہوشیاری سے درختوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ کسی درخت کا ٹہن پکڑ کر اس کے ساتھ لٹک جاؤں اور ٹٹو کو جانے دوں لیکن ٹٹو تیز دوڑ رہا تھا۔

میں نے پیچھے دیکھا۔ ریچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر مجھے ڈر اس لیے زیادہ لگ رہا تھا کہ ٹٹو مجھے جنگل کے خطرناک حصّے میں لے جا رہا تھا جس کے متعلق میں نے خوفناک کہانیاں سُنی ہوئی تھیں۔ آگے جنگل گھنا تھا اور چٹانیں بھی تھیں جن میں سے بعض اُونچی تھیں اور بعض سیدھی دیواروں کی طرح تھیں۔ یہ جگہ دیکھ کر ہی ڈر لگتا تھا۔ اچانک بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں اور چھ سات بھیڑیے کہیں سے آگئے۔

بھیڑیوں کو دیکھ کر ٹٹو یکلخت رُک گیا اور فوراً ہی رخ بدل کر بھاگ اُٹھا۔ بھیڑیے اسے گھیرنے کے لیے چاروں طرف ہو گئے۔ وہ اسے سامنے سے روکنے لگے۔ میرا اب بچ نکلنا ناممکن تھا۔ میں کندھے سے بندوق اتارنے لگا۔ عین اُس وقت ٹٹو نے تیزی سے رُخ بدلا اور بائیں کو مڑ گیا۔ میں سنبھل نہ سکا اور دائیں طرف گر پڑا۔ میں ایک گھنی جھاڑی میں گرا اس لیے کوئی چوٹ نہیں آئی۔ بندوق کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گری۔ میرا تو خیال تھا کہ تین چار بھیڑیے مجھے دو منٹ میں چیر پھاڑ دیں گے لیکن خدا نے مجھے بچا لیا۔ بھیڑیے ٹٹو کے پیچھے چلے گئے۔ میں تھوڑی دیر جھاڑی میں چھپا رہا۔ ٹٹو کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو دُور چلی گئی تھیں۔ پھر میں نے ٹٹو کی ایسی آواز سُنی جیسے وہ سخت مصیبت میں ہو۔ بھیڑیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بھیڑیے ٹٹو کو کھانے میں لگے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر میں مجھے وہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ میں جھاڑی سے باہر نکلا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بہت خوفناک جگہ تھی۔ ایک طرف اُونچی چٹان کی سیاہ دیوار تھی۔ باقی علاقہ درختوں سے بھرا ہُوا تھا۔ میں اپنی بندوق ڈھونڈنے لگا۔ یہ سرکاری بندوق تھی جو گُم کر دینے پہ مجھے سزا ملتی۔ میں جُھک کر اِدھر اُدھر بندوق کو تلاش کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں

نے جسم کو ایک طرف جھٹکا دیا لیکن وہ آدمی میری نسبت طاقتور تھا۔ کسی دوسرے آدمی نے میرے سَر اور مُنہ پر کپڑا ڈال دیا اور گردن کے گرد معلوم نہیں کس طرح باندھ دیا اور پھر اُنہوں نے میرے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر کے رسّی سے کس کر باندھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی نے کہا — "خاموشی سے ہمارے ساتھ آجاؤ" — ایک نے میرے ایک کندھے پر اور دوسرے نے میرے دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ چلانے لگے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اُنہوں نے مجھے کیوں پکڑا ہے اور میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ میں غریب آدمی ہوں، مجھے پکڑ کر کیا کریں گے؟

"تم ہمیں پکڑنے آتے تھے" — ایک نے کہا — "ہم نے تمہیں چٹان پر کھڑے دیکھا تھا۔"

میں انہیں بھی جن سمجھنے لگا۔ میں ان کی منتیں کرتا گیا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں لیکن وہ خاموش رہے اور دھکیلتے ہوئے آگے ہی آگے لے جاتے رہے۔ شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا جب تھوڑی دُور سے کسی کی آواز سنائی دی —

"ایک ہی ملا؟" — میرے ساتھ والے ایک آدمی نے جواب دیا — "ہاں۔ ابھی ایک ہی ملا ہے۔ باقی دُور رہتے ہیں۔ اِدھر یہ اکیلا ہی آیا تھا۔"

میں دل میں دعائیں کرنے لگا کہ یا خدا، پہرہ دینے والے اِدھر آنکلیں اور مجھے بچالیں۔ اس کے ساتھ جب مجھے یہ خیال آیا کہ یہ انسان نہیں جن ہیں جو انسانوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں تو میرے جسم کی طاقت ختم ہو گئی۔ پھر آواز آئی — "یہاں بٹھا دو" — میری آنکھوں پہ کپڑا پڑا ہوا تھا اس لئے دیکھ نہ سکا کہ کون ہے۔ آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں بہت سے آدمی ہیں پکتے ہوتے گوشت کی خوشبو بھی آرہی تھی۔ مجھے بٹھا دیا گیا اور پوچھا گیا — "تم شیر کی کھال ڈھونڈ رہے ہو یا کھال اتارنے والوں کو؟"

"میں کچھ بھی نہیں ڈھونڈ رہا" — میں نے التجا کی اور کہا — "خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔"

"گھبراؤ نہیں" — اُس نے کہا — "تمہارے سارے ساتھی یہاں

آجائیں گے۔ ہم سب کو شیر کی کھال دیں گے۔ وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ رہے ہیں" — اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا — "اسے وہیں پھینک دو۔ کل اس کی کھال اتار کر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں پھینک آنا۔"

میں بہت ہی مجبور تھا۔ آنکھوں پر کپڑا اور ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور یہ ڈر بھی تھا کہ یہ لوگ انسان نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ اُنہوں نے مجھے اٹھایا اور ایک طرف لے گئے۔ شاید دو اڑھائی سو قدم دُور گئے ہوں گے کہ آگے چڑھائی آگئی۔ انہوں نے مجھے اوپر کو دھکیلا۔ میں چڑھتا گیا۔ پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر مجھے جھکا دیا اور آگے کو دھکیلا۔ تین چار قدم آگے جا کر انہوں نے مجھے سیدھا کیا۔ تھوڑی دُور آگے چلا کر مجھے بٹھا دیا۔ انہوں نے میری ٹانگیں لمبی کر کے ٹخنے اس سے باندھ دیتے۔ پھر میرے سر اور مُنہ پر ڈالا ہوا کپڑا کھول دیا۔ میں سمجھا کہ کپڑا بہت دیر آنکھوں پر رہنے کی وجہ سے اندھیرا ہے اور ابھی آنکھوں کو سب کچھ نظر آجائے گا لیکن اندھیرا ویسے ہی رہا۔ اُس وقت میں سمجھا کہ یہ غار ہے۔ غار کا مُنہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ کوئی لمبا غار تھا۔ چوڑا اور اُونچا بھی تھا۔ آگے جا کر گھوم جاتا تھا۔

وہ آدمی چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ لوگ کون ہیں۔ کیا یہ جن ہیں یا انسان ہیں؟ مجھے یہ یاد آگیا کہ پرانے ملازموں نے بتایا تھا کہ جنگل میں ڈاکو آکر چھپا کرتے ہیں۔ میں جس زمانے کی بات سنا رہا ہوں، یہ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ اُس وقت ہندوستان میں ڈاکوؤں کا بہت زور تھا۔ لوگ قافلوں میں سفر کرتے تھے اور اکثر لُوٹے جاتے تھے۔ ریل گاڑیوں پر بھی ڈاکے پڑتے تھے۔ جوان لڑکیاں اغوا ہوتی تھیں اور ڈاکو جنگلوں میں چُھپا کرتے تھے۔ انگریز ان کے خلاف پولیس اور فوج کو استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہے جو عارضی طور پر یہاں آچھپا ہے اور شیر کی کھال بھی اُنہوں نے اتاری ہے لیکن ندی والی لڑکی، ہرن اور ریچھ یاد آئے تو مجھے شک ہو گیا کہ یہ لوگ انسان نہیں اور جب مجھے یہ یاد آیا کہ

یہ لوگ میری کھال اتاریں گے تو میرا دماغ بے جان ہو گیا۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ خدا کو بہت یاد کیا۔ درود شریف یاد تھا وہی پڑھتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے میرے دماغ میں آئی کہ اگر مرنا ہی ہے تو میں بزدلی سے کیوں مروں۔ ذرا سا بھی موقع ملے تو میں لڑوں گا اور نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مجبور جانور کی طرح نہیں مروں گا۔ یہ شاید خدا کے کلام کا اثر تھا کہ میرا دل دلیر ہو گیا۔ میں نے ٹانگیں اور بازو ہلا کر دیکھا۔ رسیاں بہت پکی بندھی ہوئی تھیں۔ پھر میں سرک کر پیچھے غار کی دیوار کے ساتھ ہو گیا اور پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں سے دیوار کو محسوس کرنے لگا کہ اگر وہاں کوئی کنارے والا پتھر ہو تو اس کے ساتھ ہاتھوں والی رسی کو رگڑتا ہوں، شاید کٹ جائے۔ میں نے سرک سرک کر دیوار کو کئی جگہ سے ٹٹولا مگر کسی بھی جگہ نوکیلا یا تیکھے کنارے والا پتھر نہیں نکلا تھا۔

ادھر سے مایوس ہو کر میں غار کے فرش پر کوئی ابھرا ہوا پتھر ٹٹولنے لگا مگر میری مراد پوری نہ ہوئی۔ اتنے میں باہر سے کسی کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں بیٹھا رہا۔ اب غار میں مجھے اتنا نظر آنے لگا جتنا رات کے اندھیرے میں باہر کھلے آسمان کے نیچے نظر آتا ہے۔ دو تین سائے سے میرے قریب آئے۔ ایک نے میرے پاؤں کو ٹھوکر مار کر کہا — ”کیوں رے! شیر کی کھال لا دوں؟ فکر نہ کر۔ کل تیری کھال تیرے صاحب کو دے دیں گے“ — میں چپ رہا۔ پھر اُس نے کسی کو دھکا دیا اور کوئی میرے قریب بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا — ”ادھر سے بھاگنے کی نہ سوچنا۔ یہ چھوکری تجھے بتائے گی ہم کون ہیں“ — اور سارے باہر کو چلے گئے۔

وہ چلے گئے تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی عورت تھی جو میرے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ ہندو لڑکی ہے۔ چودہ پندرہ دن گزرے اُس کی شادی ہوئی ہے۔ اُس کی ڈولی اپنے گاؤں سے سسرال کے گاؤں جا رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ ساتھ بیس بائیس باراتی تھے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ یہ لوگ پیدل

جا رہے تھے۔ آدھے راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ انہوں نے معلوم نہیں کتنے ہی باراتیوں کو قتل کر دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ اس لڑکی کو ڈاکو اٹھا لے گئے۔ زیورات اور نقدی بھی لوٹ لی اور اس جنگل میں آ گئے۔ اس لڑکی نے ابھی اپنے دُولہا کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہاں لا کر ڈاکوؤں کا لیڈر اسے روزانہ شام کے وقت شراب پلاتا اور پھر اسے عیاشی کا ذریعہ بناتا تھا۔

لڑکی نے کہا — ”وہ بہت طاقتور آدمی ہے۔ اس کے ساتھ سولہ آدمی ہیں۔ وہ اس کا غلاموں کی طرح حکم مانتے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کو اجازت نہیں کہ مجھے بُری نظر سے دیکھے۔ اُس نے اس غار سے تھوڑی دُور بیلوں اور جھاڑیوں کی بڑی خوبصورت جگہ بنائی ہوئی ہے۔ ایک روز اس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ مجھے بچھانے کے لئے شیر کی کھال چاہیئے۔ اس کے ساتھ شیر کا سر بھی ضرور ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے اسے کہا کہ جنگل میں گولی چلائی تو پکڑے جائیں گے۔ زہر سے شیر کو ماریں گے۔ چار پانچ روز اس کے آدمی جنگل میں جاتے رہے لیکن شیر کی کھال نہ لا سکے۔ ایک روز اُنہوں نے اسے خبر سنائی کہ ایک شیر نے ان کا پھینکا ہوا زہریلا خرگوش کھا لیا ہے اور دوسرے دن وہ شیر کی کھال لے آئے جس کے ساتھ سر بھی تھا۔“

”آج ندی پر تم نہانے گئی تھیں؟“ — میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں“ — اُس نے جواب دیا — ”ایک آدمی مجھے روزانہ نہلانے کے لئے لے جاتا ہے۔ وہ چھپ جاتا ہے اور میں کپڑے اُتار کر ندی میں چلی جاتی ہوں۔“

”تم نے وہاں ہرن دیکھا تھا؟“ — میں نے پوچھا۔

”نہیں“ — اس نے جواب دیا — ”میری حالت تو ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں ہوں اور آگے پیچھے کیا ہے۔ یہ آدمی وحشی ہے۔“ وہ پھر رو پڑی۔

میرے شکوک رفع ہو گئے۔ ندی میں نہانے والی یہی مظلوم لڑکی تھی جسے میں جن اور بدروح سمجھتا رہا۔ ہرن اتفاق سے وہاں آ گیا تھا اور جس ریچھ نے

میرا راستہ روکا تھا وہ بھی اتفاق تھا۔ میرا دماغ ٹھکانے پر آگیا اور خون جوش مارنے لگا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ خود بھی نکلنے کی کوشش کروں گا اور اس لڑکی کو بھی نکال لوں گا۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ اُس نے بتایا کہ جب وہ اسے یہاں لاتے تھے تو دن رات اسے سردار اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن پانچ چھ دنوں سے اسے اس غار میں چھپا دیتا ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے باہر نکالتا ہے اور رات کو اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کے آدمیوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے شیر کی کھال لاتے ہیں۔ لڑکی یہ ساری باتیں سردار کے پاس بیٹھی سُن رہی تھی۔ ان لوگوں نے انگریز کپتان کو وہاں دیکھا تھا۔ تین ڈاکو قریب ہی کہیں چھپے ہوتے تھے۔ وہ شیر کا پیچھا کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شیر زہر سے مرنے والا ہے۔ وہ اس کے مرنے کے انتظار میں چھپے ہوتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہم ایک آدمی کو وہاں چھپا کر واپس آ گئے تھے۔ ہم انگریز کپتان کے ساتھ وہاں سے دُور چلے گئے تو انہوں نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا اور شیر کی کھال اور سر اُتار کر لے گئے۔

لڑکی نے ان کی ساری بات سُنی تھی۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جنگل کی گارد نے گشتی پہرہ شروع کر دیا ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ پہرے داروں پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی اس حصے میں آئے تو اسے پکڑ لائیں اور اسے قتل کر کے زمین میں دبا دیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ لڑکی کو سارا دن باہر نہ رکھا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس اچانک اُدھر آ نکلے۔ چنانچہ جس وقت ہمارے پہرہ دار جنگل میں گشت کرتے تھے، ڈاکو جھاڑیوں یا درختوں میں چھُپ کر انہیں دیکھتے رہتے تھے۔ صرف میں ہی بدقسمت تھا جو اِدھر آ نکلا۔ اگر ریچھ نہ ملتا تو میں ٹیلے سے ہی واپس چلا جاتا لیکن مجھے موت وہاں تک لے گئی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ غار کے باہر کوئی پہرے پر کھڑا ہوتا ہے؟ اُس نے بتایا کہ آج کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے وہاں کسی کا پہرہ نہیں ہوتا تھا۔ انہیں یقین ہو گا کہ لڑکی بھاگ کر جائے گی کہاں۔ وہ رات

کے وقت درندوں کی ڈراؤنی آوازیں سُنتی رہتی تھی۔ ڈاکوؤں نے ایک لڑکی کو میرے پاس بٹھا کر یہ بھی نہ سوچا کہ وہ میرے ہاتھ اور پاؤں کھول دے گی۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ جنگل کے اس حصے میں انہی کی حکمرانی ہے جہاں کے متعلق انہیں یقین ہے کہ کوئی بھاگ نہیں سکتا ورنہ وہ ایسی بے احتیاطی نہ کرتے۔

لڑکی نے کہا —— "اگر مجھے پتہ چل جاتے کہ انہوں نے شیر کو جو زہر دیا تھا وہ انہوں نے کہاں رکھا ہُوا ہے تو میں وہ کھا کر مر جاؤں۔ اس وحشی نے مجھے کہا تھا کہ رانیوں کی طرح عیش کرنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ رہو لیکن میں نے اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا تھا کہ مجھے گھر جانے دو۔ اس نے کہا ہے کہ تم گھر نہیں جا سکو گی۔ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں تمہیں کسی نواب یا مہاراجے کے پاس بیچ دوں گا۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔ یہاں سے کس طرح نکلوں"

اُس نے یہ بھی بتایا کہ رات کے وقت ایک آدمی اسے غار میں سے لیئے آتا ہے اور اپنے سردار کے حوالے کر دیتا ہے۔ صبح تک وہ اس کے پاس رہتی ہے۔ صبح بہت دیر تک سوتی رہتی ہے۔ جب جاگتی ہے تو اسے ندی پر نہانے کے لئے لے جایا جاتا ہے۔ لڑکی نے میرے متعلق بتایا —— "جب تمہیں یہاں لے آتے تھے تو سردار نے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ کل صبح اسے قتل کر دینا اور اس کی کھال اور سر اُتار کر ڈاک بنگلے کے قریب پھینک آنا تاکہ جنگل کے دوسرے لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔"

میں نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ فرار کے لئے تیار رہے۔ میں نے بہت دیر سوچ سوچ کر ایک ترکیب اپنے دماغ میں تیار کر لی۔ مجھے ڈر صرف یہ تھا کہ وہ ہندو لڑکی تھی۔ بُزدلوں کی اولاد تھی۔ اگر مسلمان ہوتی تو مردوں کی طرح میرا ساتھ دیتی۔ مجھے اس لڑکی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میری رسیاں کھول دے لیکن رسیاں ٹخنوں اور کلائیوں پر اسی طرح لپٹی رہنے دے تاکہ کوئی اندر آ کر ماچس جلا کر دیکھے تو وہ سمجھے کہ میں بندھا ہُوا ہوں۔ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ میں زندہ نکل جاؤں گا لیکن یہ یقین ضرور تھا کہ بھاگنے کی کوشش کروں یا نہ کروں مجھے اب مرنا ہی ہے —— لڑکی جوں ہی

میری رسیاں کھولنے لگی باہر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ مجھ سے دُور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک آدمی نے میرے اُوپر جھک کر کہا — "کل صبح تم آزاد ہو جاؤ گے" — پھر اس نے لڑکی سے کہا — "اس کا خیال رکھنا" — لڑکی چالاک معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا — "تمہارا کیا خیال ہے یہ بھاگ جائے گا؟" — وہ چلا گیا۔ شاید مجھے ہی دیکھنے آیا تھا۔

اس کے جانے کے بہت دیر بعد لڑکی باہر نکل گئی۔ اس پر زیادہ پابندی نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد واپس آئی۔ کہنے لگی — "باہر کوئی نہیں ہے۔ سورج غروب ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد سب اکٹھے کھانا کھانے بیٹھیں گے۔ شراب پئیں گے۔ ڈاکے اور رہزنی کی باتیں کریں گے۔ پھر سردار ایک آدمی کو یہاں بھیجے گا جو مجھے اس کے پاس لے جائے گا۔ اس وقت نکلنا آسان ہو گا۔ بشرطیکہ تم اس آدمی کو قابو میں کر لو۔"

میں نے اسے کہا کہ رسیوں کی گانٹھیں کھول دے۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر میرے ہاتھوں اور ٹخنوں کی رسیوں کی گانٹھیں کھول دیں اور رسیاں وہیں لپٹی رہنے دیں۔ میرا دل اُچھلنے لگا۔ اب میرا مقابلہ موت کے ساتھ تھا۔ میں نے پھر خدا کے کلام کا وِرد شروع کر دیا۔ مجھے ابھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صرف جوانی کا جوش تھا اور یہ غیرت کہ اس مظلوم لڑکی کو ان وحشیوں سے بچانا ہے۔ وقت آگے ہی نہیں ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ ایک آدمی نے غار کے مُنہ میں سے ہی آواز دی — "چلو چھوکری" — وہ اندر نہیں آیا۔

ہم نے ذرا انتظار کیا۔ اس نے وہیں سے پھر آواز دی — "سو گئی ہو؟ جلدی آؤ" — لڑکی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا کہ وہ چُپ رہے۔ وہ چُپ رہی۔ مجھے اس آدمی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قریب آ کر اس نے ماچس جلائی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لڑکی کا بازو پکڑا۔ لڑکی اُٹھی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ماچس بُجھ گئی۔

میں نے رسیوں سے ہاتھ نکالے پھر ٹخنوں سے رسیاں الگ کیں۔ گانٹھیں پہلے ہی کھلی ہوئی تھیں۔ میں اُٹھا اور اندھیرے میں پیچھے سے اس

آدمی کے دونوں ٹخنے مضبوطی سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچے۔ وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر دونوں گھٹنے رکھ دیئے اور اس کی گردن دبا لی۔ لڑکی سے کہا کہ اس کی پگڑی اس کے مُنہ میں ٹھونس دو۔ اس نے اس کی پگڑی اُتاری اور ذرا وقت لگا کر اس کے مُنہ میں ٹھونس دی۔ پھر میں نے اسے کہا کہ رسیاں ڈھونڈو اور اس کے پاؤں باندھ دو۔ لڑکی نے اندھیرے میں ہاتھ مار کر رسیاں اُٹھا لیں۔ اس آدمی کی آواز تو نہیں نکل سکتی تھی لیکن ٹانگیں اتنی زور سے مار رہا تھا کہ لڑکی کے لئے اس کی ٹانگیں باندھنا مشکل ہو گیا لیکن وہ ہوشیار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اس کے ٹخنے باندھ دیئے۔ پھر میں نے اس کے ساتھ مل کر اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ امید یہی تھی کہ ابھی دو تین آدمی ہم پر پل پڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

ہم غار کے مُنہ تک آ گئے۔ باہر خاموشی تھی۔ لڑکی سے پوچھا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ اس نے بتایا تو میں اسے ساتھ لے کر دوسری طرف چل پڑا۔ یہاں تک مجھے وہ آنکھیں باندھ کر لائے تھے اس لئے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنا ٹھکانہ کس طرف ہے۔ لڑکی کو تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس جگہ سے نکلنا چاہیئے۔ پھر کہیں راستہ مل ہی جائے گا۔ تھوڑی دُور تک ہم ذرا آہستہ چلتے رہے۔ بہت ہی دشوار راستہ تھا۔ راستہ تو دراصل کوئی نہیں تھا۔ جھاڑیاں، درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں، پرانے درختوں کی جڑیں اور موٹی موٹی بیلیں چلنے نہیں دیتی تھیں۔ اُونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں اور اندھیرا بھی اور ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ میں خالی ہاتھ تھا اور میرے ساتھ لڑکی تھی جس کے پاؤں میں جُوتی نہیں تھی۔ میں راستہ بناتا جا رہا تھا اور وہ میری پیٹھ کے ساتھ لگی چلی آ رہی تھی۔ میں دعا یہ مانگ رہا تھا کہ کوئی درندہ نہ مل جائے۔ لکڑبگوں اور بھیڑیوں کا خطرہ زیادہ تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ چل کر جنگل ذرا کم گھنا ہو گیا۔ درخت تھوڑی دُور دُور تھے۔ اچانک شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ لڑکی چیخ مار کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے اسے ایک بازو میں لپیٹ لیا۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ اس کا جسم

کانپ رہا تھا۔ اتنی جوان اور خوبصورت لڑکی کو اپنے جسم کے ساتھ چپکا ہُوا دیکھ کر میرا جسم بھی کانپنے لگا اور میں زیادہ دلیر ہو گیا۔ میں بھی جوان تھا مگر دل میں کوئی اُلٹا سیدھا خیال آنے کی بجائے یہ ارادہ پیدا ہُوا کہ یہ لڑکی میری عزّت اور غیرت ہے۔ میں اسے نہ بچا سکا تو میں بے غیرت ہو کر مروں گا۔

اس واقعہ کو آج پچاس سال گزر گئے ہیں۔ میں اپنے بچّوں کو یہ واقعہ کئی بار سُنا چکا ہوں اور انہیں یہ سبق دیا کرتا ہوں کہ اگر انسان دل میں عزّت اور غیرت کو زندہ رکھے تو وہ شیروں اور ڈاکوؤں کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے اور جب دل میں جرم اور گناہ کا خیال آجاتا ہے تو جسم کی آدھی قوّت اور دلیری ختم ہو جاتی ہے۔ خود میں نے اس واقعہ سے یہی سبق سیکھا ہے۔

میں نے اُسے تسلّی دی اور کہا کہ اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو تو دل میں مردوں والی دلیری پیدا کر دو۔ یہ بھول جاؤ کہ تم عورت ہو۔ مگر وہ عورت ذات تھی اور وہ ہندو کی اولاد تھی۔ اس میں دلیری پیدا نہ ہوئی۔ میرے جسم سے وہ الگ ہوتی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تیز چلو ورنہ وہ وحشی آ جائیں گے اور تمہارا بُرا حال کر دیں گے۔ یہ سُنتے ہی وہ چل پڑی۔ اُس نے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ آگے جھاڑیوں وغیرہ کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہمارے چلنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ بہت دُور جا کر چٹانوں نے راستہ روک لیا۔ سیدھا جانے کی بجائے ہمیں دو چٹانوں کے درمیان سے بائیں طرف راستہ بنانا پڑا۔ مجھے ڈر یہ لگ رہا تھا کہ کہیں گھومتے گھومتے میں پھر ڈاکوؤں کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔ چٹانوں کے درمیان سے گزرتے ہم پھر دائیں طرف ہو گئے۔ لڑکی نے کہا — ”مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ جسم ٹوٹ رہا ہے“ — میں سمجھ گیا کہ اس درندے سردار نے اسے شراب پلا پلا کر اور اس کے ساتھ وحشیوں کی طرح سلوک کر کر کے اس کے جسم کا بہت بُرا حال کر دیا ہے ورنہ اُس زمانے میں اس کی عمر کی لڑکیاں بیس بیس میل بغیر رُکے پیدل سفر کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جسمانی طاقت کا زمانہ تھا مگر یہ لڑکی آدھی مری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ یہ دوسری مشکل تھی۔ وہ چلتی بھی کیسے! میں نے سوچا کہ اس کے

پاؤں زخمی ہو چکے ہوں گے۔ اس سے پاؤں کے متعلق پوچھا تو وہ رونے لگی

میں اسے پھر بھی چلاتا رہا۔ اب ہم ایک چٹان کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کوئی ایک میل دُور ایک شیر تھوڑی دیر بعد گرجتا تھا۔ ایک طرف سے لکڑبگوں کے چیخنے کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لکڑبگا دراصل چیختا نہیں، انسانوں کی طرح زور زور سے ہنستا ہے کہیں بھیڑیئے بھی بھونک رہے تھے۔ ان درندوں میں سے کوئی بھی ہمیں ختم کر سکتا تھا۔ سارا جنگل ہمارا دشمن تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم دو میل چل چکے تھے اور تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اچانک پیچھے سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر باتیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور چٹان کی ڈھلان پر چڑھ گیا۔ وہاں جھاڑ زیادہ تھی۔ درخت بھی تھے۔ ذرا ہی اُوپر جا کر ہم دونوں ایک درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ جھاڑی کی اوٹ اچھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چھ سات آدمی دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ یہ ڈاکو تھے جو ہمارے تعاقب میں جا رہے تھے۔ اب ہمارا آگے جانا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ اونچی بات نہ کرے۔ وہ اس قدر نڈھال تھی کہ میرے اُوپر گر پڑی۔ میں نے ٹانگیں لمبی کر کے اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ لیا اور اسے لٹا دیا۔ وہ سو گئی۔

مجھے بھی اُونگھ آنے لگی لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں جاگتا رہا۔ بہت دیر ہو گئی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ یہ آدمی جو آگے نکل گئے ہیں واپس آ جائیں گے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کسی دوسری طرف سے واپس چلے جائیں گے۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اس طرف گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا ٹھکانہ اسی طرف ہے۔ لہٰذا میں صحیح راستے پر تھا۔ وہاں ایک ایک منٹ گزارنا مشکل تھا۔ میرا خیال ہے کہ دو گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ مجھے بھیڑیوں کے بھونکنے اور غرّانے کی ایسی آوازیں سُنائی دینے لگیں جیسے وہ کسی شکار کے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ بہت تیز دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھیں۔ اندھیرا تھا۔ پہلے شاید دو تین آدمی دوڑتے ہوتے

اُس طرف چلے گئے جدھر سے میں آ رہا تھا۔ ان کے پیچھے بھیڑیے دوڑ رہے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے انسانوں کا واویلا اور چیخیں سنائی دیں اور بھیڑیوں کی ایسی آوازیں جیسے انہوں نے شکار کو پکڑ لیا ہو۔ میں ان آوازوں کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ میرے لیے خدائی امداد تھی۔ یہ ڈاکو ہی تھے جو بھیڑیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ بھیڑیے بھی لکڑبگوں کی طرح گروہ میں حملہ کرتے ہیں۔

لڑکی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ مجھے یہ تو تسلی ہو گئی کہ بھیڑیوں نے ان آدمیوں کو پکڑ لیا ہے اور بہت دیر تک انہیں کھانے میں مصروف رہیں گے لہٰذا میں نکل سکتا ہوں مگر یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ بھیڑیوں کی آوازوں اور شکار کے گوشت کی بُو پر لکڑبگے بھی آ سکتے ہیں اور شیر بھی۔ پھر بھی میں نے لڑکی کو جگایا اور اسے چلنے کو کہا۔ ہم ڈھلان سے اُترنے لگے تو اس کے پاؤں چونکہ زخمی تھے اس لیے پاؤں جما نہ سکی اور گر پڑی۔ ڈھلان زیادہ اُونچی نہیں تھی لیکن اسے چوٹیں آئیں اور جب میں نے اسے اٹھا کر چلنے کو کہا تو وہ دو قدم چل کر رُک گئی۔ رو کر کہنے لگی کہ نہیں چلا جاتا۔ دراصل بیٹھنے اور سونے کی وجہ سے اس کے پاؤں کے زخم اور چوٹیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ اب اس کے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے کندھے پر ڈال لیا اور چل پڑا۔ یہ ایک اور مشکل پیدا ہو گئی۔ میں یہ بوجھ اُٹھائے ہوئے چلتا رہا۔ اسے میں نے کندھوں پر اس طرح اُٹھایا ہوا تھا کہ میں آگے کو جُھک گیا تھا۔ آگے دُور تک میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بھی ایک خطرہ تھا۔

میں چلتا ہی رہا۔ درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان پر کان لگائے ہوئے تھا کہ کوئی آواز میری طرف تو نہیں آ رہی۔ چٹانیں بھی راستے میں آئیں۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ آخر ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ میں ٹانگیں گھسیٹنے لگا۔ ایک جگہ درخت کا تنا گرا ہوا تھا۔ میں دیکھ نہ سکا۔ ٹھوکر سے میں گر پڑا۔ اُٹھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا ٹانگوں کو آرام دیا اور اب پیاس نے پریشان کر دیا۔ لڑکی نے بھی کہا کہ پیاس لگی ہے۔ میرا تو مُنہ کھل گیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ ندی کس طرف ہے۔ میں نے لڑکی

کو کندھے پر ڈالا اور چلنے لگا۔ وقت کا اندازہ اس سے کیا کہ چاند نکل آیا تھا۔ چاند رات کے پچھلے پہر نکلتا تھا۔ میں چٹانوں میں گزر کر ذرا کھلے حصّے میں گیا تو کسی کی باتیں سنائی دیں۔ وہ ڈاکو ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے پھر وہی داؤ کھیلا کہ قریب والی چٹان کی ڈھلان کے ساتھ دو ایسے درختوں کے پیچھے بیٹھ گیا جو آپس میں ملے ہوئے تھے اور کچھ پودوں نے اوٹ بنا رکھی تھی۔ چاند روشن ہو گیا تھا۔ چاندنی درختوں کی وجہ سے پوری روشنی نہیں دیتی تھی لیکن اب آدمی نظر آ جاتا تھا۔ بالکل میرے قریب دو آدمی آ کر رُک گئے۔ وہ اپنے سردار کو، لڑکی کو اور مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ سردار نے انہیں کہا ہے کہ لڑکی نہ ملی تو وہ سب کو مار ڈالے گا اور یہ بھی پتہ چلا کہ سردار خود بھی لڑکی کی تلاش میں نکلا ہُوا ہے۔ لڑکی نوجوان اور خوبصورت تھی۔ اسے کوئی بھی اپنے ہاتھ سے نکلنے نہ دیتا۔

میں نے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا۔ ایک کے کندھے کے ساتھ بندوق لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرے کے پاس تلوار تھی۔ لڑکی میرے ساتھ لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا کہ اس آدمی سے بندوق چھین لوں مگر وہ دو تھے۔ وہ بھی شاید میری طرح تھک گئے تھے۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ انہیں شاید ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ ان کے کچھ ساتھیوں کو بھیڑیے کھا گئے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کے متعلق بڑی غلیظ باتیں شروع کر دیں اور اپنے سردار کو گالیاں دینے لگے کہ وہ کسی اور کو لڑکی کے قریب نہیں جانے دیتا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ وہ وہیں بیٹھ کر رات گزارنا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ دس گز دُور نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ درندوں کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں۔ رات گزر گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہونے والی تھی۔ لڑکی سو گئی۔ میں نے نیند پر بڑی ہی مشکل سے قابو پایا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا —— ”ذرا سو نہ لیں؟“ —— دوسرے نے جواب دیا —— ”سو جاؤ یار۔ پھر چلیں گے“ —— میں نے دیکھا کہ وہ وہیں لیٹ گئے۔ جس کے کندھے کے ساتھ بندوق تھی،

اس نے بندوق کندھے سے اُتار کر اپنے قریب رکھ دی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کر کے میں آہستہ سے اُٹھا اور کیڑوں کی طرح سرک سرک کر ایک طرف ہٹتا گیا۔ ان سے ذرا دُور ہٹ کر میں ڈھلان سے اُترا۔ کوشش یہ تھی کہ پاؤں کی آواز نہ آتے اور کوئی آہٹ نہ ہو۔ میں بیٹھے بیٹھے ان کی طرف بڑھا۔ آگے ایک درخت کا تنا تھا۔ میں اس تک پہنچا۔ وہ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور گہری نیند سو گئے تھے۔ بندوق میری طرف والے پہلو کے ساتھ پڑی تھی۔ میں تنے کے قریب لیٹ گیا۔ وہاں سے ہاتھ لمبا کیا تو بندوق تک پہنچ گیا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اس میں کارتوس بھرے ہوتے ہوں گے۔

میں نے بندوق اُٹھائی۔ خاصی وزنی تھی کیونکہ دو نالی تھی۔ پوری طرح اُٹھ نہ سکی کیونکہ میں نے پیٹ کے بل لیٹے ہوئے بازو پورا آگے کر کے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں لے بندوق گھسیٹ لی۔ اس کا مالک بیدار ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے اُٹھا۔ میں نے اسی تیزی سے بندوق کھینچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دوسرا آدمی بھی جاگ اُٹھا۔ بندوق والا ہوشیار تھا وہ بھاگ کر ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا ساتھی اُٹھا تو میں نے اس پر گولی چلائی مگر چلی نہیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے گھوڑے (ہیمر) چڑھاتے نہیں تھے۔ اس زمانے میں ہیمر والی بندوقیں ہوتی تھیں۔ میں نے جلدی سے دونوں گھوڑے چڑھائے۔ یہ آدمی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اِدھر سے اس کے ساتھی نے اسے آواز دے کر کہا — "وہاں سے ہٹو" — اِدھر میں لے گولی چلا دی۔ یہ آدمی وہیں لٹو کی طرح گھوما اور گر پڑا۔ اُدھر سے لڑکی نے ڈر کر چیخ ماری۔

دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کے پیچھے ہو گیا تھا۔ میں اُٹھ کر سامنے آ گیا اور للکار کر کہا — "سامنے آ جاؤ ورنہ ڈھونڈ کر گولی مار دوں گا"۔ وہ سامنے نہ آیا۔ البتہ دوڑنے کی آواز آئی اور ختم ہو گئی۔ میں اُس طرف دوڑا لیکن وہ کہیں دبک گیا تھا۔ میں اسے مارے بغیر بھی جا سکتا تھا لیکن ضرورت یہ تھی کہ بندوق تو میں نے اس سے لے لی تھی۔ کارتوسوں کی بیلٹ اُس کے پاس تھی۔ میرے پاس صرف ایک کارتوس تھا جو دوسری نالی میں پڑا تھا۔ وہ چلا کر بندوق صرف

لاٹھی تھی۔ میں چُھپ چُھپ کر آگے بڑھنے لگا۔ اِدھر لڑکی نے چیخ چیخ کر بُرا حال کر دیا تھا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہوا کہ اسے کسی نے پکڑ تو نہیں لیا۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ میرے دائیں طرف بھی کوئی دوڑا۔ میں نے رُک کر دیکھا۔ درختوں میں سے گزرتی ہوئی چاندنی میں مجھے وہ آدمی دوڑتا نظر آیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں لے بہت جلدی سے بندوق اُدھر کر کے گولی چلا دی۔ وہ دوڑتا رہا پھر گر پڑا۔ میں اُس کی طرف دوڑا۔ وہ اُٹھا اور چلنے لگا مگر چل نہ سکا۔ میں اس تک پہنچ گیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا مجھے بخش دو۔ چھرّے اس کی ایک ران میں سے گزر گئے تھے۔ میں نے اس سے کارتوسوں کی بیلٹ لے لی اور بھاگتا ہوا لڑکی تک پہنچا۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

میں نے اسے چُپ کرایا اور کہا کہ اس کی آواز پر باقی ڈاکو آ جائیں گے۔ مجھے وہاں سے جلدی نکلنا تھا۔ گولیوں کی آواز پر ڈاکوؤں کے آ جانے کا خطرہ تھا جو صحیح ثابت ہوا۔ لڑکی چلنے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے اسے کندھوں پر اُٹھا لے سے پہلے چاندنی میں دیکھا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ جگہ میں نے دیکھی ہوئی تھی۔ ابھی تک میں خطرناک علاقے میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ندی یہاں سے تھوڑی دُور ہے اور مگرمچھوں والی جھیل بھی ہے۔ میں لے اپنے راستے کا اندازہ لگایا اور لڑکی کو کندھوں پہ اُٹھا لیا۔ یہی میرے لئے مشکل تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو کبھی کا نکل گیا ہوتا۔ ذرا سی دیر بعد صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ میرا اب پیاس اور تھکن سے یہ حال ہو گیا تھا کہ میں اگر گھر میں ہوتا تو گر پڑتا۔ وہاں چونکہ خطرہ تھا اس لئے میں تیز چل رہا تھا۔ صبح کی روشنی دیکھی تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں چلتا گیا۔

اچانک میرے پیچھے سے گولی چلی۔ گولی کی سیٹی میرے قریب سنائی دی اور گولی میرے آگے زمین پر لگی۔ یہ دھماکہ بندوق کا نہیں رائفل یا پستول کا تھا۔ یہ چھرّے نہیں تھے گولی تھی۔ میں نے تو اپنے آپ کو مُردہ سمجھ چکا تھا لیکن میرے قریب ایک درخت تھا۔ میں بھاگ کر اس کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کے پاس ہی چند فٹ اُونچی چٹان تھی میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ لڑکی

کو بٹھا دیا اور بندوق کی دونوں نالیاں بھر لیں۔ میں نے اوٹ سے سامنے اور ہر طرف دیکھا۔ ایک گولی اور آئی جو میرے قریب لگی۔ مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ روشنی صاف ہوتی گئی۔ کوئی ڈیڑھ سو گز دُور ایک آدمی ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر ایک طرف کو دوڑا۔ میں نے اس پہ فائر کیا لیکن نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ایک اور درخت کے پیچھے ہو گیا۔ اُس نے مُنہ اور سر پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میری نظر اُس پر رہی۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ میرے دائیں طرف سے دو گولیاں چلیں۔

فوراً اور گولیاں چلیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے للکار سنائی دی۔ "ہوشیار ہو کے" — اس آواز سے میرے جسم میں جان آگئی۔ یہ آواز جنگل کی گارد کے کسی ملازم کی تھی۔ میں نے اس آواز کے جواب میں کہا — "اوہو، آہو، آہو" — میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ ڈرے نہیں۔ وہیں بیٹھی رہے۔ اپنے آدمی آگئے ہیں۔ میں آڑ میں ایک طرف کو سرکنے لگا۔ میں اس آدمی کو مارنا چاہتا تھا جو درخت کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ میں رینگتے ہوئے اور چھُپتے ہوئے کچھ دُور ہو گیا۔ وہ آدمی بہت ہوشیار تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا اور پستول سیدھا کر کے گولی چلائی مگر میں گولی چلنے سے پہلے ہی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ میں نے اُس پہ گولی چلائی لیکن وہ درخت سے ہٹ کر چٹان کے اندر چلا گیا۔ میں اُٹھ کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

کسی نے میرا نام پکارا اور کہا — "رنگے ہوشیار ہو کے" — میرا نام اورنگ زیب خان ہے۔ مجھے رنگا کہتے تھے۔ پھر آواز آئی — "صاحب کہتا ہے زندہ پکڑو" — میں رُک گیا۔ میرے چار ساتھی آگئے تھے۔ یہ اس روز کی گشت کی پہلی پارٹی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں حکم ملا تھا کہ مجھے تلاش کریں۔ ہمارا صاحب جو اینگلو انڈین مسٹر اینڈریو تھا، گارد کے ساتھ خود آیا تھا۔ یہاں وہ میری بندوق کی آواز پہ اور پستول کی آواز پہ آتے تھے۔ اُنہوں نے ڈاکوؤں کو دیکھ لیا اور سمجھے بھی۔ صاحب نے ان چاروں کو پھیلا دیا۔ مجھے بھی ایک

طرف بھیج دیا اور خود رائفل اُٹھاتے آگے بڑھنے لگا۔ ان سب نے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ ہم اس جگہ کو گھیرے میں لے کر آگے بڑھنے لگے۔ دو آدمی اُس چٹان کے اُوپر چڑھ گئے جس کے پیچھے وہ چلا گیا تھا۔ میں دوسری سمت چلا گیا اور چٹان کے پیچھے جا پہنچا۔ مجھے وہ نظر آگیا مگر اب گولی چلانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے اُسے پکار کر کہا — "پستول پھینک دو۔ اب بچ کر نہیں جا سکو گے" — اُس نے میری طرف گولی چلائی۔

دوسری طرف سے اسے اینڈریو صاحب نے بھی دیکھ لیا اور کہا کہ پستول پھینک دو مگر اس نے اُدھر بھی گولی چلائی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ گھیرے میں ہے۔ وہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ ایک اوٹ سے نکل کر دوسری اوٹ میں چلا جاتا۔ ایک بار اینڈریو صاحب نے اس کے قریب گولی ماری تاکہ وہ ڈر جائے لیکن وہ نہیں ڈرا۔ ذرا سا نظر آتا اور غائب ہو جاتا۔ ہم نیم دائرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ پیچھے ندی کی جھیل تھی۔ جھیل اونچی چٹانوں کی دیوار میں گھری ہوئی تھی۔ ہماری طرف جو کنارہ تھا وہ بھی چٹان تھی مگر اس طرف سے میدان تھی۔ وہ آدمی پیچھے ہٹتا گیا۔ ایک بار نظر آیا۔ وہ اب جھیل کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اینڈریو صاحب نے بلند آواز سے کہا — "پیچھے مت ہٹو، مارے جاؤ گے" — لیکن وہ پیچھے دیکھے بغیر پیچھے ہٹ گیا اور غائب ہو گیا۔ وہ جھیل میں گر پڑا تھا۔

اینڈریو صاحب اُس کی طرف دوڑا۔ مجھے اس آدمی کی جھیل میں سے چیخیں سنائی دیں۔ ہم سب دوڑ کر پہنچے۔ چھوٹے چھوٹے سات آٹھ مگرمچھوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور اسے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مگرمچھ اسے پانی کی تہہ میں لے گئے۔ اس کے بعد اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

میں نے واپس آکر لڑکی اپنے صاحب کے حوالے کی۔ اسے سارا قصہ سنایا۔ جنگل کی تلاشی لی گئی۔ دو ڈاکو زخمی حالت میں ملے۔ چار لاشیں اس حالت میں ملیں کہ کھوپڑیاں اور جسموں کے کچھ حصے باقی تھے۔ انہیں بھیڑیوں نے کھایا تھا۔ دو میرے ہاتھ سے مرے تھے۔ جسے ران پر چھرّے لگے تھے وہ بھی مرا ہُوا ملا۔ دو کو صبح گارد نے مارا تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی زخمی حالت

میں پکڑا گیا۔ اس نے بتایا کہ جو جھیل میں گرا اور مگرمچھوں کا نوالہ بنا ہے وہ ان کا سردار تھا۔ مگرمچھوں نے ایک معصوم دلہن کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا اور جہاں ڈاکو ٹھہرے ہوتے تھے وہاں صرف شیر کی کھال اور چند ایک بیکار چیزیں پڑی تھیں اور جو کچھ تھا وہ شاید ان کے بچے کھچے ساتھی لے گئے تھے۔

لڑکی کو اس کے گاؤں چھوڑ آئے۔ مجھے ایک تو سرکاری انعام پانچ سو روپیہ ملا اور دو سو روپیہ لڑکی کے باپ نے دیا۔

* *

اردو ڈاٹ کام

جنگل کا بھیدی جنگل کی نذر ہو گیا

تانوائے ایک قانون شکن شکاری ہونے کے باوجود اتنی خوبیوں کا مالک تھا کہ میں نے اپنی طویل شکاری زندگی میں ایسے لوگ کم ہی دیکھے ہیں جو دلیری، جفاکشی اور جنگلی زندگی کے تجربے میں اس کے ہم پلہ ہوں۔ ان ساری خوبیوں کے ساتھ اس کی گھمبیر شخصیت اور چٹان جیسا مضبوط جسم اُسے سیام کے جنگلوں میں کسی بھی ممتاز قبیلے کی سرداری دے سکتے تھے، لیکن اُسے مجرمانہ زندگی زیادہ پسند تھی جو اُسے راس نہ آ سکی اور وہ ایک قانون شکن ہی کی حیثیت سے سفرِ آخرت پر روانہ ہُوا۔

ابھی چند ہی روز پیشتر مجھے اُس گاؤں کا پتہ چلا جہاں وہ پیدا ہُوا تھا۔ دریائے پاجان کی دوسری جانب سیام کے گھنے جنگلوں میں یہ گاؤں بنکاک جانے والی سڑک سے کچھ ہٹ کر واقع ہے۔ گاؤں میں اُس کے ساتھیوں سے گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہُوا کہ بچپن ہی سے وہ غیر معمولی دلیر تھا اور اوائل جوانی میں گاؤں بلکہ گرد و نواح میں بھی کوئی اس کے مقابلے کا شکاری نہ تھا لیکن اُسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ گینڈے کے شکار میں بڑی دولت ہے۔ دریائے پاچان کے پار برطانوی ہند کا علاقہ اس شکار کے لیے بے حد مناسب تھا۔ تانوائے نے گاؤں بھر سے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور دولت کی خاطر دریا پار چلا گیا جہاں سے واپس آنا اُسے نصیب نہ ہو سکا۔ میں اُس کے ضعیف باپ سے بھی ملا جو آج بھی اُس کے انتظار میں ہے اور کسی صورت میں یہ ماننے

پر تیار نہیں کہ اس کا شیر جیسا بیٹا کسی دلدل کی تہہ میں بے جان پڑا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ میری اپنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ اُسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرتا لیکن اُس کی صورت دیکھ کر میرے سامنے ایک بار پھر تانوائے کی صورت پھر گئی اور میں اُن دنوں کی یاد میں کھو گیا جب میری ملاقات تانوائے سے ہوئی تھی۔

کئی برس گزرے میں اُن دنوں ملایا میں دریائے یاچان اور خلیج بالیون کے سنگم پر مقیم تھا۔ میرے پاس دو نر ہاتھیوں اور ایک گینڈے کے شکار کا لائسنس تھا۔ برطانوی ہند میں یہ گینڈا نایاب تھا۔ نیپال کی ترائی کے علاوہ جنوبی آسام ہی وہ واحد علاقہ ہے جہاں یہ گینڈا پایا جاتا ہے اور یہاں بھی اس کی نسل قانون شکن شکاریوں کے ہاتھوں ختم ہوتی جا رہی ہے حالانکہ یہ جنگل بے حد گھنے ہیں اور شکاریوں کی کسی جماعت کو باقاعدہ طور پر اس جنگل کی گہرائیاں کھوجنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود جنگلوں کے باشندے بلا لائسنس بندوقوں سے چھُپ کر شکار کھیلتے اور ان کا زیادہ تر نشانہ یہی گینڈا بنتا۔ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے وکٹوریہ پوائنٹ کے جنگل کے محکمے نے قوانین وضع کیے اور ممنوعہ علاقے کے گرد و نواح میں آتشیں ہتھیاروں پر سخت پابندی لگا دی۔ ہر گاؤں کے لوگی یعنی کھیا کو بندوق رکھنے کی اجازت تھی لیکن اس کے علاوہ ہر بندوق خلافِ قانون تھی۔ خصوصی جنگلاتی محافظ بھرتی کیے گئے جو ہر وقت شکاریوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے تھے۔

تانوائے کا نام ان قانون شکن شکاریوں میں سرِ فہرست تھا لیکن محکمۂ جنگلات کی ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود جب میں گینڈے کی تلاش میں نکلا تو مجھے جا بجا تانوائے کی موجودگی کے نشانات ملتے حالانکہ دریائے یاچان کے اس طرف اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کئی بار مجھے درختوں پر اس کی کلہاڑی کی کاٹ نظر آئی۔ چار متوازی لائنوں سے کٹی ہوئی دو عمودی لائنیں یعنی چار شکاری جن میں سے دو بندوقیں رکھتے تھے لیکن اس کی قانون شکن سرگرمیوں کا منہ بولتا ثبوت بھی ایک روز ہمیں مل گیا۔ ہم کئی دنوں سے ایک کے بعد ایک دلدلی قطعے کی نگرانی کر رہے تھے اور ہمیں چند مقامات پر گینڈے کی

موجودگی کے نشانات بھی ملے تھے اور مجھے اپنی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ایک روز میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اُس روز میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل میں دُور تک گھس گیا کیونکہ گینڈے کے قدموں کے نشانات اس کے جنگل میں جانے کی گواہی دیتے تھے۔ گرمی کی شدت کے باعث جنگل جہنم بنا ہُوا تھا اور ہم پسینے سے شرابور جسموں کو دلدلی راستوں پر گھسیٹتے اس امید پر بڑھے جا رہے تھے کہ جلد یا بدیر ہماری ان تکلیفوں کا انعام ہمیں مل جائے گا اور اچانک وہ ہمیں مل بھی گیا لیکن ایسی حالت میں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ ہم بے حد گھنے درختوں کے ایک جھُنڈ کو پار کر کے نسبتاً کھُلے دلدلی قطعے میں جا نکلے تھے اور وہاں ہماری نظروں کے عین سامنے ایک گینڈے کا پنجر پڑا تھا۔ قریب ہی راکھ کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا جو ابھی سلگ رہا تھا اور ساتھ ہی ایک بڑے سے لکڑی کے برتن کے جلے ہُوئے ٹکڑے اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ گینڈے کا گوشت کا ایک ایک اونس اُبال کر اُس سے خون اور اس کا آخری قطرہ بھی نچوڑا جا چکا ہے۔ یہی چیزیں ایک گینڈے کی حقیقی قیمت ہُوا کرتی ہیں — دُور افتادہ رنگون میں رہنے والے چینی اس رس کو سونے سے تول کر بھی خرید لیتے ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ گینڈے کے گوشت کا ہر ذرّہ اور خون کا ہر قطرہ جسمانی پوشیدہ قوتیں رکھتا ہے اور ناتواں انسانوں کے لیے آبِ حیات ثابت ہوتا ہے۔ ان جاہلانہ خیالات کے پیشِ نظر گینڈے کے جسم کا کوئی حصّہ ضائع نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ پیشاب اور فضلہ بھی رنگون بھیج دیا جاتا ہے جہاں اُسے طرح طرح کی مقوّیات بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی متمول چینی صرف ڈھانچے کے لیے ایک ہزار روپے دے سکتا ہے اور تقریباً اتنی ہی قیمت گینڈے کے سینگ کی مل جاتی ہے جسے پیس کر مختلف مقوی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ وجوہات جنہوں نے گینڈے کے شکار میں پیشہ ور شکاریوں کے لیے بے حد کشش پیدا کر دی تھی اور سیام کے جنگلوں میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت کا اصل سبب بھی یہی تھا۔

اس واقعے کے بعد کئی روز گزر گئے۔ روزانہ ہی میں مقامی شکاریوں کے ساتھ جنگل کے گھنے اور دشوار گزار حصے میں صعوبتیں اٹھاتا، لیکن گوہرِ مقصود سے اتنا ہی دُور رہتا جتنا کہ پہلے روز تھا حتیٰ کہ میری چھٹیاں ختم ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا اور مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ کوئی بھی مقامی شکاری صلاحیت کے اعتبار سے تانوائے کا ہم پلہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یوں بھی سبھی شکاری اُس سے ڈرتے تھے اور بعض دفعہ تو اس علاقے میں بھی جانے سے انکار کر دیتے جہاں انہیں تانوائے کی موجودگی کا شک ہوتا۔ بلاشبہ تانوائے اس جنگل کا بے تاج بادشاہ تھا۔

انہی خیالات میں گُم میں ایک روز مالیون کے بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہا تھا اور ایک واقف چینی کو باتوں باتوں میں میری پریشانی کا علم ہُوا۔ بوڑھے چینی نے مجھے مشورہ دیا کہ مَیں تانوائے سے دوستی کر لوں۔ صرف اسی صورت میں مَیں اُسے پکڑ سکتا ہوں۔ اُس روز شام کو سوچتے سوچتے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میرے لیے صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ کسی طرح تانوائے سے مل کر اُس سے دوستی کر لوں اور دوستی کے پردے میں اُسے پکڑ دوں۔

صبح ہوتے ہی میں نے کائی لون کو بلا بھیجا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُسے تانوائے کا ایجنٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچے کہ اگر تانوائے گینڈے کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرے تو مَیں مقامی محکمۂ جنگلات میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کروں گا کہ اُسے اس کی بندوق کا لائسنس بھی مل جائے اور شکار کھیلنے کا اجازت نامہ بھی۔ مقامی افسروں سے میرے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ بالفرض اگر افسرانِ محکمہ اُسے کسی صورت میں بھی معاف کرنے پر رضامند نہ ہُوئے تو مَیں جلد از جلد یہ کوشش کروں گا کہ میرے اور تانوائے کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلے حائل ہو جائیں۔ تب اور صرف تب ہی اُسے میرے وعدوں کی ناپائیداری کا احساس ہو گا اور اُس وقت میں کم از کم ایک ہزار میل دُور پہنچ چکا ہوں گا۔

میں مانتا ہوں کہ سوچنے کا یہ طریقہ قانون اور اخلاق کی نظر میں قابلِ گرفت ہے، لیکن میرا واسطہ ایک مشہورِ زمانہ مجرم شکاری سے پڑنے والا تھا اور میں نے اُس کے ہتھکنڈے اُسی پر آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی روز آدھی رات کے بعد میں کائی لون کے ہمراہ مالیون کے بازار سے گزر رہا تھا۔ دکانیں بند تھیں اور بے گھر غریب مزدور درجنوں کی تعداد میں فٹ پاتھ پر ٹانگیں پسارے پڑے سو رہے تھے۔ جنگل کی زندگی جاگ رہی تھی۔ ذرّہ ذرّے کی گھات میں اور رات کے شکاری اپنی اپنی جد و جہد میں مصروف تھے۔

ہم دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے اور دُور دریا میں چپوؤں کی شپاشپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر دریا کی چھوٹی چھوٹی لہروں نے ہمارے اجنبی ملاقاتی کی آمد کا اعلان کیا۔ چند لمحوں بعد اندھیرے سے ایک بڑی کشتی پانی کی سطح پر نمودار ہوئی اور ہمارے قریب ہی کنارے پر آ لگی۔ ایک سیاہ فام تنومند شخص کشتی سے اُترا اور اُس نے ہمیں دیکھا۔ وہ تانوائے تھا۔ اُس کے عقب میں چار جوان بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے۔ میں اپنے کپڑوں میں ایک پستول چھُپا لایا تھا۔ ابھی میں تانوائے پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔ تانوائے اور کائی لون کے درمیان ایک ناقابلِ فہم سی زبان میں باتیں ہو رہی تھیں۔ تانوائے کا ایک ساتھی کشتی کی رسّی کو یوں تھامے کھڑا تھا جیسے پلک جھپکنے میں فرار ہونے پر آمادہ ہو۔

کافی دیر گذر گئی۔ گفتگو میں آہستہ آہستہ ٹھہراؤ سا آتا گیا۔ میں اس اثنا میں محض ایک خاموش تماشائی کی مانند کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ تانوائے کچھ کہتے ہوئے مُڑا اور بڑھ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں باڈی گارڈ بھی فوراً کشتی میں چلے گئے اور چند لمحوں میں کشتی اندھیرے کی چادر میں تحلیل ہو گئی۔ اُن کے جانے کے بعد کائی لون نے مجھے بتایا کہ اگر تانوائے نے میرے وعدوں کو قابلِ توجہ سمجھا تو کل کسی وقت ہمیں اس کی اطلاع مل جائے گی اور فوراً ہی ہم گینڈے کی تلاش میں روانہ ہو جائیں گے۔ یہ سُن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور نسبتاً مسرور دل کے ساتھ کائی لون کے ہمراہ اپنے ٹھکانے کی طرف واپس ہُوا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت ہمیں تانوائے کی رضامندی کی اطلاع مِل گئی۔ اُس نے ہمیں کم از کم دو دن کے راشن اور دیگر ضروری اشیاء کے ساتھ دس میل دُور ٹین کی ایک ویران کان پر پہنچنے کو کہا تھا۔ اُس نے میری شرائط مان لی تھیں۔ میں نے سوچا اب میرا واسطہ سیام کے خطرناک ترین قانون شکن شکاری سے پڑنے والا تھا اور وہ یقیناً میرے ہمراہ کسی غیر شخص کی موجودگی پسند نہ کرے گا۔ اس لیے مَیں نے صرف اپنے مسلمان اردلی ماجد کو ساتھ لے لیا اور ایک فوجی تھیلے میں ایک کیتلی اور ٹین کے دو پیالوں کے علاوہ جتنا کھانے پینے کا سامان آسکتا تھا، ٹھونس لیا۔ میں نے ایک ٹارچ بھی رکھ لی اور دوسرے تھیلے میں ایک کمبل اور کافی کارتوس ڈال کر ماجد کے حوالے کر دیا۔ اس سامان کے علاوہ ہمارے پاس دو رائفلیں بھی تھیں میری جیب میں پستول بھی تھا۔

ہم جلد ہی تانوائے کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ حسبِ وعدہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ دن کی روشنی میں مَیں نے اُس کا اصل حُلیہ دیکھا۔ کمر سے لپٹے کپڑے کے علاوہ وہ سر سے پاؤں تک برہنہ تھا۔ اُس کا جسم چٹان سے تراشا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈال رکھی تھی جس کے ساتھ ہی پہلو میں بارود سے بھرا ہُوا سینگ لٹک رہا تھا۔ چہرے مُہرے سے تانوائے کو بدصورت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اُس کے چہرے پر پتھر جیسا کھُردراپن تھا۔ نچلا جبڑا خلافِ معمول آگے کی طرف نکلا ہُوا تھا۔ وہ خاموش طبع انسان تھا۔ جتنے دن میں اُس کے ہمراہ رہا اس نے بمشکل دس الفاظ بولے ہوں گے اور وہ بھی اُس کے اپنے ماتحتوں کو سیامی زبان میں دیئے جانے والے احکام تھے۔ اس کی ہر حرکت میں خود اعتمادی اور وقار تھا اور جنگل میں اس کی نقل و حرکت کی قابلیت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسی جنگل میں پیدا ہُوا ہو۔

اُس نے ہمارے پھُولے ہُوئے سفری تھیلوں پر ناپسندیدگی سے بھرپور ایک نظر ڈالی اور اپنے ساتھی کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹین کی کان کے

اُوپر چڑھائی پر چل پڑا۔ ہم دونوں بھی اُس کے عقب میں چلے لیکن جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس چڑھائی پر چڑھنا ہمارے لیے اتنا آسان نہ تھا جس آسانی سے تانوائے چڑھ رہا تھا۔ ڈھلان خطرناک تھی اور پاؤں جمانے کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تانوائے اور اس کا ساتھی کافی آگے نکل گئے۔ ہم نے ہمّت نہ ہاری اور تیزی سے اُن کے پیچھے چلتے رہے اور پون گھنٹے کی شدید محنت کے بعد ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔

تانوائے نے اشارے سے ہمیں بتایا کہ ہم چاہیں تو آرام کر سکتے ہیں کیونکہ وہ گینڈے کے قدموں کے نشانات کی تلاش میں اپنے آدمیوں کو بھیج رہا ہے۔ ہم نے اپنے سفری تھیلے اُتار پھینکے اور اطمینان سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کوئی ایک ہزار فٹ نیچے وسیع و عریض گھنا جنگل پھیلا ہُوا تھا جس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی جرأت کسی سفید فام کو نہ ہوئی تھی اور اس جنگل کی ڈھکی چھپی گہرائیوں میں تانوائے گینڈے کے شکار میں میری مدد کرنے والا تھا۔ جھونپڑی میں چند خشک لکڑیاں جلا کر ہم نے چائے بنائی اور پی کر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے لیکن کان جنگل کی آوازوں پر لگے ہُوئے تھے جس میں طرح طرح کے جانوروں کی ملی جُلی آوازوں کے ساتھ مختلف جنگلی پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

اچانک اِن آوازوں سے بلند تر ہم نے جنگلی بانسوں کے ٹوٹنے کا تڑاخ سُنا اور ساتھ ہی کسی دیو ہیکل ہاتھی کی چنگھاڑ سے جنگل گونج اُٹھا۔ آواز صرف چند بار سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد تانوائے کے کھوجی واپس آئے۔ انہیں کوئی بھی نشانات نہ مِل سکے تھے اور خاص جنگلی طریقے کے مطابق اُنہوں نے آتے ہی تانوائے کے آگے خالی ہتھیلیاں پھیلا دیں اور زبان مُنہ میں گھما گھما کر آوازیں نکالیں۔ یہ ناکامی کا کھُلا ہُوا اعتراف تھا۔ تانوائے نے ان سے تو کچھ نہ کہا ترجمان کے ذریعے ہمیں اُن کی ناکامی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اگر مَیں چاہوں تو آج ہاتھی کا شکار کھیل سکتا ہوں کیونکہ نیچے وادی میں چند

ہاتھیوں کی موجودگی کے نشانات ملے تھے۔ میرے پاس چونکہ دو ہاتھیوں کے شکار کا لائسنس تھا اس لیے مَیں نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور فوراً ہی ہم دونوں تانوائے اور اُس کے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ نسبتاً آسان راستے سے پہاڑی سے اُترے اور جنگل میں داخل ہو گئے۔

ہاتھیوں کے گروہ کے نشانات تو ہمیں جلد ہی مل گئے لیکن ہم گروہ پر گولی چلانے کا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے اس لیے ہم گروہ سے بچھڑے کسی اکیلے ہاتھی کے قدموں کے نشانات کی تلاش میں پھرتے رہے۔ جلد ہی ہمیں ایک بڑے ہاتھی کے قدموں کے نشانات مل گئے جو گروہ سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ ہم فوراً ان نشانات پر چل پڑے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نے جنگل میں دُور بانس ٹوٹنے کی آواز سُنی۔ تانوائے سانپ کی طرح رینگ کر جھاڑیوں میں چلا گیا۔ ہم سب بھی بے حد احتیاط سے اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ جنگل کے اس حصے میں رات کا اندھیرا تھا اور چند فٹ کے فاصلے پر تانوائے محض ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا۔

گھنی جھاڑیوں کے ایک طویل سلسلے سے گزرنے کے بعد وہ اچانک رُک گیا۔ مَیں نے اُس کے قریب پہنچ کر دیکھا۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ہمارا شکار کھڑا تھا۔ آبنوس کی طرح سیاہ، اس کا جسم عام ہاتھیوں سے بہت بڑا تھا اور اس کے دانت اتنے بڑے قد کے باوجود زمین کو چھو رہے تھے۔ اتنے بڑے دانت دیکھ کر میرا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرے کئی سال پرانے خوابوں کی تعبیر کا وقت آ پہنچا تھا لیکن گہرے اندھیرے کی وجہ سے ہاتھی پر فائر کرنے سے کامیابی کے امکانات مخدوش تھے چنانچہ ہم ناکام لوٹ آئے۔ جھونپڑی میں پہنچے اور صبح جلد روانہ ہونے کا پروگرام بنانے کے بعد جھونپڑی کے فرش پر کمبل بچھا کر سو گئے۔

صبح ہم طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے روانہ ہو گئے اور جب تک سورج نکلا ہم پچھلی رات والے نشانات تک پہنچ چکے تھے۔ اس جگہ جہاں ہم نے پچھلی رات ہاتھی کو کھڑے دیکھا تھا پہنچ کر ہمیں معلوم ہُوا کہ ہاتھی تھوڑی دیر ٹھہر کر

آگے روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے قدموں کے نشانات گھنے بانس کے جھنڈ اور خاردار جھاڑیوں سے گزر رہے تھے لیکن تانوائے نے اپنی شکاری قابلیت سے کام لیتے ہُوئے نسبتاً کم گھنے جنگل میں ایک لمبا چکر لگانے کے بعد تقریباً دو میل پرے ہمیں نشانات پر لا ڈالا۔ اس طرح ہم نے وہ فاصلہ صرف ایک گھنٹے میں طے کر لیا جو ہاتھی نے رات بھر میں طے کیا تھا۔ یہاں نشانات کچھ زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے اور ہم آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اچانک دُور فاصلے پر ہم نے بانسوں کے ٹوٹنے کی آواز سُنی۔ تانوائے نے اپنے آدمیوں کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں نہایت خاموشی سے اُس طرف بڑھے جدھر سے آواز آئی تھی۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے گزرنے کے بعد ہم بانسوں کے ایک قطعے میں جا پہنچے۔ اس قطعے کی دوسری جانب چند گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں ہاتھی کھڑا تھا۔ اس کا پہاڑ جیسا جسم اُونچی اُونچی جھاڑیوں کے پیچھے پوشیدہ تھا۔ صرف اس کے بڑے بڑے کان اور سونڈ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا اپنے پنکھوں جیسے کان ہلا رہا تھا۔ ہم اس انتظار میں وہیں جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے رہے کہ وہ کچھ حرکت کرے اور اس کے جسم کا کوئی نازک حصہ سامنے آئے تو ہم اس پر فائر کریں۔ ہمارا فاصلہ اس سے زیادہ پانچ چھ گز تھا اور جھاڑیوں کی آڑ سے اس کا ایک کیچڑ میں لت پت دانت نظر آ رہا تھا۔

مَیں نے محسوس کیا کہ تانوائے میرے قریب نہ تھا۔ مَیں نے دیکھا تو وہ مجھ سے چند قدم دُور کھڑا ایک درخت کی چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر میری طرف مڑا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ جلد ہی ہوا کا رُخ تبدیل ہو جائے گا لہٰذا مجھے جلد ہی فائر کر دینا چاہیے۔ اس نے اپنے شانے سے بارود سے بھرا سینگ اُتار لیا اور بندوق بھرنے لگا۔ ہوا کی تبدیلی تو میں بھی کچھ کچھ محسوس کرنے لگا تھا۔ بہت جلد ہاتھی ہماری موجودگی محسوس کر کے یا تو ہم پر حملہ کر دیتا اور یا راہِ فرار اختیار کر لیتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اچانک ہی جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر اس پر فائر کر دوں۔ ہاتھی موٹی عقل کا حیوان ہے اور اس سے اتنے فوری ردِ عمل کی توقع

نہیں کی جا سکتی۔ لیکن میں اس خطرے سے آگاہ تھا کہ اگر میرا یہ فائر مہلک ثابت نہ ہوا تو چند ہی ثانیوں میں ہاتھی میرے اُوپر ہو گا اور مجھے اپنے بچاؤ کا بالکل موقع نہ مل سکے گا۔ موت کے اتنے قریب کھڑے ہو کر میں نے کبھی گولی نہیں چلائی تھی۔

جُونہی میں جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا ہاتھی بھی مُڑا اور مجھ سے دُور ہٹنے کے لیے پاؤں اٹھایا۔ میں نے اس کے دماغ کا نشانہ لے کر بندوق کی دونوں نالیاں فائر کر ڈالیں۔ گولیاں لگتے ہی ہاتھی درد و کرب سے اتنے زور سے چنگھاڑا کہ زمین لرزنے لگی اور پھر اچانک ہی دھم سے گرا جیسے کسی ریل کے انجن نے پوری طاقت سے اُسے ٹکر ماری ہو۔ ساتھ ہی میں نے اپنے عقب سے بھی فائر کی آواز سُنی۔ یہ تانوائے کی ایل ایم کی آواز تھی۔ میں نے وہیں رُک کر بندوق کا ریچ کھولا تاکہ تازہ کارتوس ڈال سکوں لیکن ہاتھی اچانک ہی تیزی سے اُٹھا اور طوفان کی سی تیزی سے بانس کے گھنے جنگل میں گھستا چلا گیا۔

میں نے فوراً بندوق میں کارتوس ڈالے اور ہم دونوں اس کے تعاقب میں دوڑے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ ایک مختصر دوڑ ہو گی۔ تانوائے چند ہی منٹوں میں مجھ سے کئی سو گز آگے نکل گیا۔ میں گرے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں سے بچتا بچاتا پسینے میں شرابور اس کے پیچھے دوڑتا رہا لیکن ہاتھی کی حرکت کی آوازیں دُور سے دُور تر ہوتی گئیں اور پھر جنگل کے سناٹے میں گُم ہو گئیں۔ آگے بڑھنا بے کار تھا اس لیے میں وہیں رُک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔

تانوائے بھی واپس آ گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ ہاتھی بری طرح زخمی ہو چکا ہے اور ہم کچھ دیر سستا کر دوبارہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوں گے۔ ہمارے باقی ساتھی بھی ہم سے آ ملے۔ میرے کہنے پر ماجد نے وہیں چند خشک لکڑیاں جلا کر چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ شاید میرا نشانہ خطا گیا تھا ورنہ طاقتور سے طاقتور جانور بھی ۴۷۰ء رائفل کی دو گولیاں لگنے کے بعد اتنی جلدی ہوش میں نہیں آ سکتا۔ شاید گولی محض ہاتھی کی کھال کھرچتی گزر گئی ہو۔

اس اثنا میں تانوائے نے اپنے ایک ساتھی کو ہاتھی کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا۔ پھر ہم سب اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ سورج نصف النہار سے ڈھلتا جا رہا تھا۔ گرمی بے پناہ تھی۔ راستے میں جا بجا خون کو دیکھ کر میرے شبہات زائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہاتھی کا زخم یقیناً کھال کا زخم نہ تھا۔ کھال کے زخم سے اتنی مقدار میں خون نہیں نکل سکتا تھا۔ تقریباً دو میل تک ہم ان نشانات پر چلتے رہے۔ پھر تانوائے نے ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود جھاڑیوں میں گُم ہو گیا۔ کم و بیش ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا اور ہمیں بتایا کہ ہاتھی اُس کے اندازے کے مطابق زیادہ دُور نہیں۔

ہم اُس کی رہنمائی میں ایک دلدلی وادی میں داخل ہوئے۔ یہاں نرم زمین پر جا بجا ہاتھی کے قدموں کے نشانات تھے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان راستوں پر بہت سے ہاتھی گزر چکے ہیں اور ہم کسی طرح یہ اندازہ نہ لگا سکتے تھے کہ ہم اپنے شکار کا تعاقب کر رہے ہیں یا کسی انجانے ہاتھی کے تعاقب میں دوڑ رہے ہیں۔ یہ بات تو صرف تانوائے ہی بتا سکتا تھا جس کا تجربہ ہم سے بہت زیادہ تھا۔

ہمیں اس کے تعاقب میں چلتے کئی گھنٹے گزر گئے۔ ہم تھک کر شل ہو چکے تھے لیکن ہاتھی کے بڑے بڑے سفید دانتوں کے لالچ نے تھکان محسوس نہ ہونے دی۔ اچانک بلا کسی گرج چمک کے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ چند ہی منٹوں میں کپڑے بھیگ کر ہمارے جسموں سے چمٹ گئے۔ رات گزارنے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش ہوئی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم نے پانی کے ایک بڑے سے گڑھے کے قریب ڈیرہ جما لیا۔

ذرا دیر بعد تانوائے نے پانی کے ندی نما گڑھے سے نجانے کس طرح چند مچھلیاں پکڑ لیں۔ اس کے ساتھیوں نے فوراً آگ جلا کر چاول اُبال لیے اور مچھلیوں کو بھی آگ پر روسٹ کر لیا۔ ہم نے اپنا راشن کا تھیلا کھولا اور سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ چائے بنائی اور ایک پیالہ پی کر لیٹ گئے۔ تانوائے کے ساتھیوں کا جلایا ہُوا آگ کا الاؤ آہستہ آہستہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ ذرا دیر بعد بادلوں سے چاند نکل آیا۔ میں نے اِردگرد دیکھا۔ تانوائے

کے سارے ساتھی زمین پر سو رہے تھے لیکن تانوائے ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے سینے کے مسلسل زیر و بم سے ظاہر تھا کہ وہ بھی اونگھ رہا ہے۔ میں نے ماجد کو آنکھیں کھلی رکھنے کو کہا۔ وقتاً فوقتاً آگ میں چند لکڑیاں بھی ڈالنے کی ہدایت کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی سو گیا۔ دن نکلنے سے دو گھنٹے پہلے ماجد نے مجھے جگا دیا اور خود سو گیا۔

صبح کا اُجالا پھیلنا شروع ہُوا۔ میرے کپڑے رات بھر میں جسم کی حرارت سے خشک ہو چکے تھے۔ تانوائے دن نکلنے سے پیشتر ہی اپنا ایک آدمی ہاتھی کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا۔ ہم بھی تعاقب میں چل پڑے اور تانوائے کے ساتھی سے جا ملے۔ تانوائے نے اُس سے کچھ باتیں کیں پھر ہماری طرف گھوم کر ہاتھوں کی خالی ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہاتھی کے تازہ قدموں کے نشانات نہیں مل سکے تھے اور اب اس کی تلاش میں مزید آگے بڑھنا بے کار تھا۔ پھر اس نے ہوا میں ہاتھ ہلا کر ہمیں بتایا کہ ہمارے لیے زخمی ہاتھی ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے اور اب اسے ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ میں نے اُسے مزید کوشش پر آمادہ کرنے کی بہت سعی کی لیکن اُس نے اشاروں سے واضح کر دیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ ہاتھی کے تعاقب میں مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنی بندوق کا لائسنس ملے یا نہ ملے۔ پژمُردہ سے دل کے ساتھ ہم واپس روانہ ہُوئے۔ تانوائے اور اُس کے ساتھی ٹین کی کان تک ہمارے ساتھ آئے اور اس کے بعد میں اور ماجد مالیون کی طرف روانہ ہوئے اور شام کو مالیون پہنچ گئے۔

مالیون میں دوسرا روز آرام سے گزارا اور پھر کائی لون سے ملا تاکہ تانوائے سے دوبارہ ملاقات کا بندوبست ہو سکے لیکن اس سے معلوم ہُوا کہ تانوائے کل شام ہی واپس چلا گیا تھا۔ ”لیکن اُسے تو گینڈے کی تلاش میں میری مدد کرنا تھی“ میں نے احتجاجاً کہا۔ جس کے جواب میں کائی لون محض شانے جھٹک کر رہ گیا اور پھر دبے الفاظ میں بولا ”بہتر ہے آپ کچھ روز انتظار کر لیں۔ شاید وہ ایک

دو روز میں واپس آ جائے۔“

اب میرے پاس انتظار کے لیے وقت نہ تھا۔ تین روز بعد مجھے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا اور ایسے موقعے پر تانوائے کا بغیر اطلاع چلا جانا مجھے اچھا نہ لگا۔ یہ معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی اور میرے دل میں اس کی اس حرکت کے خلاف غم و غصّے کا طوفان سا اُٹھ رہا تھا۔ میرا پُرانا شکاری ساتھی مہابیر سنگھ ابھی مالیون میں ہی تھا۔ اُس نے تانوائے کے ساتھ میرے گٹھ جوڑ کو اپنی شکاری قابلیت کی توہین سمجھا تھا۔ جب میں اُس کے گھر پر اس سے ملنے گیا تو اس کے چہرے سے ناراضگی کا اظہار عیاں تھا لیکن جب میں نے اُسے یقین دلایا کہ میرا تانوائے کے ساتھ اتحاد محض چند غلط قسم کے لوگوں کے مشورے سے عمل میں آیا تھا تو اُس کا چہرہ جیسے کھِل اُٹھا۔

مہابیر سنگھ ایک لمبا تڑنگا گورکھا تھا۔ فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ مزاج کا بہت تیز تھا اس لیے زیادہ عرصہ فوج میں نہ ٹِک سکا۔ ڈسچارج ہونے کے بعد اُس نے سیام آگر ٹین کی کان میں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن کان بند کر دی گئی، مہابیر سنگھ پھر بیکار ہو گیا۔ اس نے اپنے وطن واپس جانے کے بجائے مالیون کے گرد و نواح میں شکاری گائیڈ کی حیثیت سے بڑے بڑے شکاریوں کی ملازمت کر لی۔ میرا اس سے کئی بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ بہت دلیر آدمی تھا۔ دو بار شیر کے پنجوں سے بچ نکلا تھا جس کے نشانات جا بجا اس کے جسم پر تھے اور سب سے واضح نشان اس کی بائیں گال پر تھا جہاں کسی شیر کے پنجے نے بہت سا گوشت اُدھیڑ ڈالا تھا۔

ان جنگلوں کا چپّہ چپّہ اُس کا جانا پہچانا تھا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اب کبھی اس کے علاوہ کسی شکاری کو گائیڈ نہ رکھوں گا تو وہ بہت خوش ہُوا اور میرے آئندہ پروگرام میں دلچسپی لینے لگا۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے اس زخمی ہاتھی کو تلاش کیا جائے۔ مجھے شک سا پڑ رہا تھا کہ تانوائے نے اس ہاتھی کے معاملے میں میرے ساتھ کوئی چال کھیلی تھی ورنہ وہ تعاقب سے باز نہ آتا۔ مجھے اُس وقت اس پر اتنا غصّہ آ رہا تھا کہ میں جلد از جلد اسے

بلا لائسنس بندوقوں سمیت پکڑ کر قانون کے حوالے کر دینا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس صرف تین دن تھے۔ اور تین دن بعد مجھے بہرحال واپس جانا تھا۔

ایک بار پھر ہم نے اپنے سفری تھیلے خوراک سے بھرے اور مہابیر سنگھ کے چار مقامی کھوجی بھی ساتھ لے لیے۔ دوسرے روز علی الصبح ہم روانہ ہو گئے اور بلاڑو کے اُس مقام تک پہنچے جہاں تانوائے نے ہاتھی کے تعاقب میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مہابیر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بہت جلدی ہاتھی کے قدموں کے نشانات ڈھونڈ نکالے۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ ہاتھی بُری طرح زخمی ہے اور زیادہ دُور نہیں جا سکتا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم سات آٹھ میل علاقے کے گرد ایک فرضی دائرہ سا کھینچ لیتے ہیں۔ اگر ہاتھی کے قدموں کے نشانات اس خیالی دائرے سے باہر نکل گئے اور ہمیں اس کی موجودگی کا کوئی تازہ نشان نہ ملا۔ تو ہم مزید وقت اس کی تلاش میں ضائع نہیں کریں گے۔

ہمیں خلافِ اُمید بہت کامیابی ہُوئی۔ ہاتھی کے قدموں کے نشانات دو میل کے دائرے سے باہر نہ جاتے تھے۔ وہ اسی علاقے میں کہیں چھپا زخموں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے تانوائے کی عیاری کا بھی یقین آ گیا۔ مجھے شروع ہی سے اس کے خلوصِ نیت پر شک تھا۔ اُس نے مجھے بے وقوف سا شکاری سمجھ لیا تھا جسے وہ جنگل میں اپنی مرضی کے مطابق نچا سکتا تھا۔ اگر اس نے مجھے دھوکا نہ دیا ہوتا تو مَیں یقیناً مقامی حکام سے اس کے تعلقات بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا لیکن اب ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔

ہم فوراً ہی واضح نشانات پر چل پڑے۔ بھیگی ہُوئی جھاڑیوں اور درختوں سے سورج کی حرارت کے باعث بھاپ سی اُٹھ رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا سا عالم تھا۔ کسی بھی وقت ہمارا ہاتھی سے سامنا ہو سکتا تھا۔ ہم تیزی سے چلتے جا رہے تھے۔ اچانک دُور جنگل میں ہم نے حرکت کی آواز سُنی۔ ہم جم کر رہ گئے۔ آواز چونکہ تیزی سے ہماری جانب چلی آ رہی تھی اس لیے مَیں نے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو جھاڑیوں کی آڑ میں چھپنے کے لیے کہا اور خود بھی ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔

چند لمحوں بعد سامنے درختوں کے جھنڈ سے دوڑتا ہُوا ایک نیم برہنہ جنگلی آدمی نکلا۔ میں نے بیک نظر اُسے پہچان لیا۔ وہ تانوائے کا ایک ساتھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور وہ بھاگتا ہُوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہمیں اس سے تانوائے کے بارے میں بے حد مفید معلومات مِل سکتی تھیں۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو مَیں نے تیزی سے ٹانگ بڑھا کر اُسے اڑنگا مار دیا۔ اس کے گرتے ہی جھپٹ کر اس کی بندوق پر قبضہ کر لیا۔ میرے ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ مَیں نے اُسے مہابیر سنگھ کے حوالے کر دیا۔ پھر ہم نے اس سے کچھ سوالات پُوچھے لیکن ایسے طریقے سے کہ بہت جلد اس نے ہار مان لی اور بہت سی تلخ حقیقتیں بتلانے لگا۔

میرا خیال بالکل درست تھا۔ تانوائے نے شروع ہی سے وہ ہاتھی اپنے لیے منتخب کر لیا تھا کیونکہ اس جنگل میں کبھی ایسا ہاتھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تانوائے کے ساتھ پھرتے ہُوئے محض اتفاق سے وہ ہاتھی ہماری نظر میں آ گیا۔ تانوائے اس وقت مجھے فائر کرنے سے تو باز نہ رکھ سکا، لیکن میرا نشانہ یا تو خطا گیا یا ہاتھی ہی کچھ زیادہ سخت ہڈی کا نکلا اس لیے مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد تعاقب کے دوران تانوائے روانگی سے پہلے اپنے ساتھی کو اس لیے آگے بھیج دیا کرتا تھا کہ وہ ہاتھی کو ایک جگہ نہ ٹھہرنے دے اور ہمیشہ اُسے حرکت میں ہی رکھے تاکہ وہ میری پہنچ سے دُور رہے۔ ہاتھی ہماری دوڑ دھوپ کے دوران ہمیشہ ہم سے میل آدھ میل آگے زخم سے بوکھلایا پھر رہا تھا اور اس بارش والی رات ہاتھی ہم سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر تھا جہاں سے سورج نکلنے سے پہلے ہی تانوائے کے ایک ساتھی نے اُسے اٹھا دیا اور بھگاتا ہُوا سمت دُھند لے گیا جس مقام پر تانوائے نے آگے چلنے سے انکار کر دیا تھا ہاتھی وہاں سے بمشکل دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اور ماجد کو ٹین کی کان کے پاس چھوڑ کر تانوائے اور اس کے ساتھی فوراً واپس ہُوئے اور دو ہی گھنٹوں میں ہاتھی کو مار گرایا۔ اور اب تانوائے اس کے کئی سو پونڈ وزنی دانت کو نزدیک ترین منڈی میں بڑی سے بڑی قیمت پر بیچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

تانوائے کے ساتھی نے ہمیں تانوائے تک لے جانے کا وعدہ بھی کرلیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ مضبوطی سے پیٹھ پیچھے باندھ کر رومال اس کے مُنہ میں ٹھونس دیا اور اُسے آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم گھنے جنگل میں گھستے چلے گئے۔ بالآخر ہم نے جنگل کے سنّاٹے کو توڑتی ہُوئی ایک آواز سُنی۔ کوئی شخص کلہاڑی چلا رہا تھا۔ سیام کے کسی بھی گاؤں میں ایسی آواز روزمرّہ کے معمولات میں شامل ہے، لیکن یہاں جنگل کی ان جھُنڈی گہرائیوں میں اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا۔ اور وہ تھا تانوائے اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی۔ ہم اپنے شکار کے قریب پہنچ چکے تھے اور مجھے اس امر میں ذرہ بھر بھی شک نہیں تھا کہ تانوائے بلامزاحمت کبھی نہ پکڑا جائے گا۔

میں نے مہابیر سنگھ سے کہا کہ وہ قیدی سے تانوائے کے ساتھیوں کی تعداد دریافت کرے۔ معلوم ہُوا کہ تانوائے سمیت اس وقت وہاں چار آدمی ہیں اور ان سب کے پاس بندوقیں ہیں۔ تانوائے کے تین ساتھیوں سے تو مجھے زیادہ خطرہ نہ تھا لیکن تانوائے کی بات اور تھی۔ وہ ایک مشہور زمانہ مجرم اور جنگل کی زندگی کا عادی تھا۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کا کوئی حل میرے پاس نہ تھا لیکن میں نے مہابیر سنگھ کے چاروں ساتھیوں کو قیدی سمیت وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور ماجد اور مہابیر سنگھ کو لے کر آگے چلا گیا۔

ماجد رائفل سے مسلّح تھا لیکن مہابیر سنگھ کی رائفل میں نے لے لی تھی۔ تانوائے کے قریب پہنچ کر اُسے ترجمان کا کام کرنا تھا۔ میرا ارادہ تانوائے کو دھوکے سے گرفتار کرنے کا تھا۔ اس لیے میں نے جنگل میں ایک لمبا چکر کاٹ کر تانوائے کی پشت پر پہنچنے کا فیصلہ کیا اور کلہاڑی کی آواز سے قریباً پچاس فٹ دُور رہتے ہوئے ہم نے نیم دائرے کی شکل کا چکر کاٹا اور پھر آواز کی طرف نہایت خاموشی سے بڑھتے جھاڑیوں کے ایک جھُنڈ کے پیچھے پہنچ کر رُک گئے۔ یہاں سے تانوائے اور اس کے ساتھی صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

تانوائے رائفل تھامے کھڑا اپنے ساتھیوں کو سیامی زبان میں ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی کلہاڑیاں لیے مرے ہوئے ہاتھی کو

چیر پھاڑ رہے تھے۔ ایک دانت کی جڑ والی ہڈی کافی حد تک کٹ چکی تھی۔

ان تینوں کی بندوقیں ان کے قریب پڑی تھیں۔ تانوائے کی آنکھیں اپنے سامنے پھیلے ہُوئے جنگل کا بار بار جائزہ لے رہی تھیں۔ شاید وہ خطرے کی بُو سونگھ چکا تھا لیکن سمت کے بارے میں اُس کا اندازہ غلط تھا۔ ہم اس وقت عین اس کے عقب میں تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم تینوں اُسی جھاڑی کی آڑ میں دبکے رہے۔ تانوائے نے دریائے پاچان کے دونوں کناروں پر خوف و دہشت کی بادشاہت قائم کر رکھی تھی اور بڑے بڑے جیالے اُس کے نام سے کانپتے تھے۔ میں نے مہابیر سنگھ کی ہمّت بڑھانے کے لیے اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور سرگوشی میں اُس سے کہا۔

”تانوائے سے کہو کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنی بندوقیں زمین پر ڈال دیں۔ وہ ہماری بندوقوں کی زد میں ہیں۔“

مہابیر سنگھ جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا اور بآوازِ بلند سیامی زبان میں تانوائے اور اس کے ساتھیوں کو للکارا۔ تانوائے اور اس کے ساتھی اس طرح جم کر رہ گئے تھے جیسے پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ لیکن ان کا یہ سکوت محض چند لمحوں کے لیے تھا۔ جونہی ہم دونوں بڑھ کر مہابیر سنگھ کے قریب پہنچے تانوائے کے ساتھیوں نے برق رفتاری سے لپک کر اپنی بندوقیں اُٹھا لیں اور ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں تانوائے اور اس کے تینوں ساتھی اپنی رائفلوں سمیت گھنے درختوں میں غائب ہو چکے تھے۔ دراصل مہذّب دُنیا کا باسی ہونے کے باعث مجھے اسلحے کے جادو پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں نے وہی جادو تانوائے پر بھی ٹھونسنے کی کوشش کی۔ نتیجہ وہی ہُوا جو ایک شیر کو بندوق دکھا کر ہینڈز اَپ کہنے سے ہوتا۔

تانوائے اور اس کے ساتھی ہمارے سامنے مورچہ قائم کر چکے تھے اور دوسرے ہی لمحے میں جنگل کے سنّاٹے میں ایک دھماکہ ہُوا اور رائفل کی گولی سرسراتی ہُوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ یہ میری للکار کا جواب تھا۔ میں نے ماجد کو ہدایت کر دی کہ وہ چار کھوجیوں سمیت تانوائے کے عقب میں پہنچنے کی کوشش

کرے۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے ہدایت کردی کہ اگر انہیں اپنے ذاتی تحفظ کے لیے رائفل چلانا کبھی پڑے تو انہیں کسی صورت میں بھی تانوائے اور اُس کے ساتھیوں پر مہلک فائر کرنے کی اجازت نہیں، محض انہیں زخمی کرنے کے لیے ٹانگوں پر فائر کر سکتے ہیں۔

ماجد نہایت خاموشی سے جھاڑیوں میں رینگ گیا۔ ہم دونوں جھاڑیوں کی آڑ میں دبکے رہے۔ تانوائے کی فطرت کو بخوبی سمجھ جانے کے بعد مجھے اس کے بھاگ نکلنے کا خدشہ نہ تھا۔ ایسے موقعے پر بھاگ نکلنے کے بعد وہ کبھی اپنے ساتھیوں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ ہم سے بمشکل تیس قدم دُور ہاتھی کا مُردہ جسم پڑا تھا اور اس سے چند ہی فٹ دُور تانوائے اور اس کے ساتھی گھنے جنگل میں پوشیدہ تھے۔ اس حالت میں تقریباً دس منٹ گزر گئے۔ پھر اچانک دوسری جانب سے دو گولیوں کی آواز آئی۔ یہ فائر ہم پر نہیں ماجد اور اس کے ساتھیوں پر کیے گئے تھے۔ جواب میں جنگل میں کچھ دُور سے ایک فائر ہُوا۔ آواز ماجد کی رائفل کی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی تانوائے کا ایک ساتھی ایک غرّاہٹ آمیز چیخ کے ساتھ جھاڑیوں سے باہر آگرا اور اس کے دو ساتھی پلک جھپکتے اُسے تنہا چھوڑ کر نکل بھاگے۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کے باعث بھاگ گئے تھے کہ دوسری جانب سے بھی انہیں جدید ہتھیاروں سے لیس حملہ آوروں نے گھیر لیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اپنی توڑے دار بندوقوں سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

تانوائے اپنے ساتھیوں کو فرار ہوتے دیکھ کر جھاڑیوں کی آڑ سے ہٹ گیا اور اپنی رائفل تھامے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کی بندوق خالی ہو چکی ہے۔ یہ میری خطرناک غلطی تھی جس کی سزا فوراً ہی مجھے مل گئی۔ رائفل کی نال جھکائے میں اس کی طرف بڑھا۔ مہابیر سنگھ میرے پیچھے تھا لیکن اس کا چلنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی زخمی درندے کے قریب جا رہا ہو۔ میری نظریں بھی بدستور تانوائے پر جمی ہُوئی تھیں۔ وہ اس جنگل کا بے تاج بادشاہ تھا اور ہم اس کی بادشاہت میں دخل اندازی

کر رہے تھے اور ساتھ ہی اسے قانون اور انصاف کی زنجیروں میں بھی جکڑنے کے درپے تھے۔ اس نے وہی کیا جو بادشاہ میدانِ جنگ میں شکست سے قبل کیا کرتے تھے۔ شکست کو فتح میں بدلنے کی ایک آخری جدوجہد۔

ہم بمشکل اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھے جب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس نے حرکت کی اور رائفل اٹھاتے ہُوئے ہم پر فائر کر دیا۔ فائر مجھ پر کیا گیا تھا لیکن میں تیزی سے ایک طرف جُھک گیا تھا اور ساتھ ہی چیخ کر مہابیر سنگھ کو بھی خبردار کیا، لیکن میری چیخ بعد از وقت ثابت ہوئی۔ گولی مہابیر سنگھ کے چہرے پر لگی اور وہ بغیر آواز گر پڑا۔ فائر کرنے کے فوراً بعد تانوائے چیتے کی سی پھُرتی سے رینگ کر گھنے جنگل میں پہنچ گیا۔ جوش و غضب سے کانپتے ہُوئے میں نے جنگل میں تحلیل ہوتے اس کے سائے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس نے ایک جھٹکا سا لیا اور لڑکھڑا کر جھکا لیکن پھر سنبھل کر ایک نظر سر گھما کر مجھ پر ڈالی اور تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ زخمی ہو چکا تھا اور زیادہ دُور نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میں مہابیر سنگھ کی طرف متوجہ ہُوا۔ وہ میرے قدموں میں بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ اُڑ چکا تھا۔ میں نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بُلایا اور ماجد کی مدد سے اس کی لاش اُٹھا کر ایک درخت کے سائے میں ڈال دی۔ لاش کے چہرے پر میں نے اپنا رومال ڈال دیا۔ میں فرطِ غضب سے کانپ رہا تھا۔ اس نے میری خدمت کرتے ہُوئے جان دی تھی اور اس کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانا میرا فرض تھا۔

میں نے اپنے تین ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور ماجد اور ایک ہوشیار کھوجی کو ساتھ لے کر فوراً تانوائے کے تعاقب میں چل پڑا۔ ہاتھی کی لاش سے دوسری جانب چند ہی قدم دُور زمین پر خون کی کافی مقدار نظر آئی۔ قریب ہی تانوائے اور اس کے ساتھیوں کی بندوقیں پڑی تھیں۔ نشانہ لیتے وقت میں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ گولی تانوائے کی ٹانگ پر ہی لگے تاکہ ہم اُسے زندہ گرفتار کر سکیں۔ معلوم ہوتا تھا میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ زمین پر چند خون آلود دھبوں کے بھی نشان تھے جن سے زخم کی نوعیت کا اندازہ لگانا

مشکل نہ تھا۔

بالسوں کے جنگل میں ہمارے سینوں تک اُونچی گھاس تھی اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہُوئے جنگل میں ہمارا کھوجی نہایت تیزی سے قدموں کے نشانات پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں زمین پر بھی خون کی کچھ مقدار نظر آ جاتی یا پھر گھاس ہی خون کی سُرخی میں رنگی ہوتی۔ رفتہ رفتہ خون کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک جگہ چھوٹی چھوٹی گھاس اس طرح دبی ہُوئی تھی جیسے کسی بھاری جسم کا وزن کچھ دیر کے لیے وہاں پڑا رہا ہو۔ مسلی ہُوئی گھاس خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ کھوجی نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اگر تانوائے کو اپنے زخم پر دھیان دینے کا موقع مل گیا تو ہم اُسے کبھی نہ پکڑ سکیں گے۔ وہ جنگل کی گہرائیوں میں گُم ہو جائے گا۔ ہم نے اپنی رفتار تیز تر کر دی۔

ارد گرد کا جنگل مجھے دیکھا بھالا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دیوانہ وار دوڑے چلے جا رہے تھے۔ کھوجی ہمارے آگے آگے شکاری کُتّے کی مانند زمین کو سُونگھتا دوڑ رہا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہم ٹین کی کان کی طرف واپس جا رہے تھے۔ تانوائے پاجان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یقیناً دریا پار کر کے سیام کی سرحد میں داخل ہوتا اور اپنے وطن کی خاک پر پناہ لینا چاہتا تھا لیکن آزادی کی آخری جدوجہد میں وہ دلدلی علاقے کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ یہاں کی دلدلوں کے ایک ایک اِنچ سے واقف تھا اور اُس کا خیال ہوگا کہ اس کے تعاقب کے دوران لاعلمی میں ہم کسی دلدل کی تہ میں پہنچ جائیں گے، لیکن میرے ساتھ جو کھوجی تھا وہ بانگی چانگ نامی گاؤں کا مکھیا تھا۔ اور اس جنگل سے خوب واقف تھا۔

دفعتاً درختوں میں ایک سایہ سا لہرایا اور تیزی سے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ تانوائے کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی اور درختوں سے بچتے بچاتے ٹھوکریں کھاتے اپنے شکار کے قریب تر ہوتے گئے۔ ہوا میں اب نمکین سی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ہم سمندر سے زیادہ دُور نہ تھے۔ قریب ہی دریائے پاجان اور خلیج مالیون کا سنگم تھا۔ ہم اب تانوائے سے صرف سو گز

دُور تھے اور اس نے بھی ہماری آہٹ سُن لی تھی کیونکہ فوراً ہی اس نے سر گھما کر ہمیں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

ڈوبتے ہُوئے سورج کی الوداعی کرنیں دریا کی سطح سے منعکس ہو کر درختوں سے چھن چھن کر چمک رہی تھیں اور اس روشنی میں مَیں نے تانوائے کو غور سے دیکھا۔ وہ کمر کے گرد لپٹا کپڑا کہیں اُتار کر پھینک چکا تھا اور مادر زاد برہنہ تھا۔ اس کے شانے پر کارتوسوں کی پیٹی اب بھی موجود تھی اور اس کی دائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے خشک ہوتے ہُوئے خون میں لتھڑی ہُوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں رحم و مروّت کی ہلکی سی کرن چمکی لیکن فوراً ہی میں نے تصوّر میں مہابیر سنگھ کا اُترا ہُوا چہرہ دیکھا۔ تانوائے میرے ایک ساتھی کا قاتل تھا۔ اُسے قانون کے حوالے کرنا میرا فرض تھا۔

سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ تانوائے دریا کے دلدلی کنارے پر دوڑ رہا تھا۔ دریا تک پہنچنے کے لیے اُسے ابھی تیس چالیس فٹ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اچانک وہ اس طرح رُکا جیسے زمین نے اُس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ میرے ساتھی کھوجی نے ہانپتے ہُوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور اُکھڑی اُکھڑی سی آواز میں بولا ”اب تانوائے کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں صاحب! وہ دوسرے کنارے تک نہیں پہنچ پائے گا۔“

ہم ابھی دلدلی قطعے سے کم و بیش ستّر فٹ دُور تھے۔ میں نے رُک کر متعجب نظروں سے کھوجی کی طرف دیکھا لیکن اُس نے نہایت اطمینان سے تانوائے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے نظر ڈالی تو تانوائے گھٹنوں تک زمین میں دھنسا ہُوا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی رفتار چیونٹی سے بھی کم تھی۔ اس کے بعد مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تانوائے ایک ریتلی دلدل میں پھنس چکا ہے جو رفتہ رفتہ اسے تہ کی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ جس قدر دلدل سے نکلنے کی کوشش کرتا اتنا ہی دھنستا چلا جا رہا تھا۔

میں نے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنا چاہا لیکن ماجد نے نہایت مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا اور بولا ”ہم اب اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہمارے پہنچنے

تک وہ دلدل میں گم ہو چکا ہوگا اور پھر ہمارے پاس کوئی رسّی بھی تو نہیں۔"

اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ تانوائے اس اثنا میں ناف تک دلدل میں دھنس چکا تھا اور جب تک ہم اس کے قریب پہنچتے وہ سینے تک دھنس چکا تھا۔ اب اُسے بغیر رسّی کے ریتلی دلدل سے باہر نکالنا ممکن نہ تھا۔ ناچار بے بسی سے وہیں کھڑے تانوائے کو دلدل سے زور آزمائی کرتا دیکھتے رہے۔ ڈوبتے ہُوئے سورج کی مانند تانوائے تیزی سے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ آخری جدوجہد کے طور پر اس نے ایک بار زور لگا کر دلدل سے نکلنا چاہا لیکن دلدل نے مزید تیزی سے اُسے نیچے کی طرف کھینچا۔ خوف اور مایوسی کی پہلی اور آخری چیخ تانوائے کے حلق سے نکلی اور وہ دلدل کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے گُم ہو گیا۔ دلدل اس کا سر ڈوبنے کے فوراً بعد برابر ہو کر اُفق کی روشنی میں چمکنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی سطح پر پانی کا آخری بُلبلا بھی پھٹ گیا اور رات کی تاریکیاں رفتہ رفتہ اس پر سایہ ڈالنے لگیں۔

* * *

ضمیر کی زنجیر

میرے والد صاحب آزادی سے پہلے برٹش انڈیا کی انڈین آرمی میں ڈاکٹر تھے۔ وہ میجر کے رینک سے ریٹائر ہوتے تھے۔ وہ دراصل نفسیات کے ڈاکٹر (سائیکارٹسٹ) تھے۔ انہیں فوت ہوتے آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے کتنے نفسیاتی کیس سناتے تھے۔ میں اُن کا ایک کیس اُنہی کی زبانی سناتا ہوں۔ والد صاحب کو اُن دو فوجیوں کے نام یاد نہیں تھے جن کا یہ کیس تھا۔ میں اُن کے فرضی نام استعمال کروں گا۔

۱۹۴۳ء میں انگریزوں کی انڈین آرمی برما میں لڑ رہی تھی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم تھی۔ پہلے جاپانی فوج نے انگریزوں کی فوج کو برما سے بھگا کر اس ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر انگریزوں نے حملہ کیا اور جاپانی پسپا ہو رہے تھے لیکن جاپانی فوج کی پسپائی انگریزوں کو بھی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ جاپانی فوجی خودکشی کے انداز سے لڑتے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے لیکن انگریزوں کی فوج کا بہت نقصان کر رہے تھے۔

جنگ میں فوجی بہت بُری طرح زخمی ہوتے ہیں۔ ایسے فوجیوں کو بھی فوجی ہسپتال میں بھیجا جاتا تھا جو زخمی نہیں ہوتے تھے۔ ان کے دماغ بیکار ہو جاتے تھے۔ اس مرض کو SRELE SHOCK کہا جاتا ہے۔ مورچوں پر دشمن کے توپ خانے کے گولے لگاتار پھٹتے رہتے تھے۔ اتنے زیادہ دھماکوں سے کسی فوجی کا دماغ ہل جاتا تھا اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے

لگتا تھا۔

میں اُس وقت جبل پور فوجی ہسپتال میں تھا۔ ایک ہندوستانی بٹالین برما کے محاذ پر زیادہ عرصہ لڑ کر جبل پور آئی ہوئی تھی۔ اسے آرام دیا جا رہا تھا۔ ایک روز ایک انگریز ڈاکٹر نے جو میجر تھا، مجھے کہا کہ وہ ایک مسلمان نائیک کو میرے پاس بھیجے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ SHELL SHOCK کا مریض نہیں لگتا تھا۔ اگر اُس کا مرض یہی ہوتا تو محاذ سے ہی پیچھے بھیج دیا جاتا۔ اُسے محاذ سے آئے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور وہ ایک مہینہ چھٹی بھی گزار آیا ہے۔ یہ انگریز ڈاکٹر اُسے نفسیاتی مریض کہہ رہا تھا۔

یہ انگریز ڈاکٹر اس نائیک میں جو ہندوستانی مسلمان تھا، اس لئے دلچسپی لے رہا تھا کہ یہ نائیک امن میں بریگیڈ کا ایتھلیٹ تھا اور محاذ پر قابل اور نڈر سیکشن کمانڈر۔ اس کا کمپنی کمانڈر جو انگریز تھا، اسے بہت پسند کرتا تھا۔ یہ میجر اس میجر ڈاکٹر کا دوست تھا۔ انگریز افسر اس نائیک جیسے فوجیوں کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اس کمپنی کمانڈر نے میجر ڈاکٹر سے کہا تھا کہ نائیک سلیمان کا علاج نہ ہوا تو اسے وہ انڈین آرمی کا بھی اور اپنا ذاتی بھی نقصان سمجھے گا۔

کمپنی کمانڈر کی سفارش سے نائیک سلیمان کو میرے پاس بھیجا گیا، ورنہ انڈین آرمی میں لاکھوں فوجی تھے۔ ہر کسی کو اتنی زیادہ توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے ویسے بھی اپنی عادت بنائی ہوتی تھی کہ میں یہ نہیں دیکھا کرتا تھا کہ مریض جسے میرے پاس بھیجا جاتا تھا وہ سپاہی ہے یا جرنیل۔ میرے لئے ہر مریض انسان ہوتا تھا۔ مریض خود تو میرے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ فوج کا طریقہ کچھ اور تھا۔ میرے پاس وہی مریض آتا تھا جسے میڈیکل آفیسر میری طرف ریفر کرتے تھے۔

سلیمان آیا تو میں نے اپنے طریقے کے مطابق اُس سے یہ نہ پوچھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے بلکہ اُس کے ساتھ بے تکلف دوستوں کی طرح محاذ کی اور بارکوں کی باتیں کیں تاکہ وہ بے تکلفی سے اپنی حالت بیان کر سکے۔ وہ پھر بھی گھبرا رہا تھا۔ میں نے مشاہدہ کر لیا کہ اُس کے ذہن پر

بوجھ ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔

”میرے جسم میں جان نہیں رہی“ —— اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ کچھ دیر چپ رہ کر اُس نے کہا —— ”مجھ پر کسی دشمن نے کالے علم کے تعویذ کر دیتے ہیں۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا اور دل پر خوف بیٹھ گیا ہے۔“

اُس دَور میں سپاہی اَن پڑھ ہوتے تھے۔ انہیں فوج میں رومن اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ نائیک سلیمان فوجی ہونے کے علاوہ دیہاتی تھا اس لئے اُس نے تشخیص خود کر لی تھی کہ اُسے کسی نے تعویذوں سے بیکار کر دیا ہے۔ دیہات میں اور شہروں میں بھی لوگ ایک دوسرے کو تعویذوں کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

نائیک سلیمان سے میں نے کرید کرید کر پوچھا تو اُس نے بتایا کہ برما کے محاذ پر اُس نے بڑی سخت جنگ لڑی ہے۔ جاپانی اپنے قدم جمانے کے لئے بے جگری سے لڑتے تھے۔ سلیمان کی بٹالین آگے تھی۔ دن رات اس کی پوزیشنوں پر گولا باری ہوتی رہتی تھی۔ کبھی جاپانی حملہ کرتے اور کبھی سلیمان کی بٹالین حملہ کرتی تھی۔ مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیاں اس طرح چلتی تھیں جیسے نلکوں سے تیز پانی بہہ رہا ہو۔ ہر وقت موت کا ڈر رہتا تھا۔

اس بٹالین کو آرام کے لئے پیچھے بھیج دیا گیا۔ نائیک سلیمان ٹھیک تھا۔ اُس کی یہ حالت بالکل نہیں تھی۔ چھاؤنی میں ایک مہینہ رہ کر سلیمان کو ایک ماہ کی چھٹی ملی۔ اُس کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ گاؤں جاتے ہی اُس کی شادی ہو گئی۔ وہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ بہت خوش تھا لیکن پہلی رات ہی اُس کی خوشی ختم ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو دُلہن کے لئے مُردہ پایا۔ وہ ایتھلیٹ تھا اور وہ فوجی بھی تھا اس لئے اُس کا جسم مضبوط اور خوبصورت تھا مگر اپنی دُلہن کے لئے اُس کا جسم بالکل بیکار ثابت ہُوا۔

اُس نے اپنی دوسری حالت یہ بیان کی کہ دُلہن کو دیکھ کر ہی اُس

کے دل پر خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ اس لڑکی کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ یہ اُس کے اپنے گاؤں کی لڑکی تھی۔ دُور پار کی رشتہ داری بھی تھی۔ نائک سلیمان نے اپنے دماغ پر اور اپنے جسم پر ایسا اثر محسوس کیا جو کسی دشمن کے کئے ہوئے تعویذوں کا ہی ہُوا کرتا ہے۔

سلیمان شادی کے بعد دس گیارہ دن گھر رہا اور اُس کی یہ حالت بگڑتی گئی، ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر اپنے پیر کے پاس گیا۔ پیر نے اُسے کہا کہ اُس پر واقعی کسی نے کالا جادُو کر دیا ہے۔ پیر نے اُسے اپنے تعویذ دیئے جن سے سلیمان کو کوئی فائدہ نہ ملا، پیر کو کچھ مالی فائدہ ہو گیا تھا۔ چھٹی ختم کر کے سلیمان اپنی بٹالین میں آگیا۔ اس سے کوئی ایسی اُلٹی حرکتیں ہو گئیں جو اس کے صوبیدار نے کمپنی کمانڈر کو بتا دیں۔ کمپنی کمانڈر نے اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے پوچھا کہ اُس نے نائک ہوتے ہوئے یہ غلطیاں کیوں کی ہیں۔ سلیمان رو پڑا اور اُس نے کمپنی کمانڈر کو بتایا کہ اُس کے دماغ اور جسم کا آپس میں تعلق ٹوٹ گیا ہے اور اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

کمپنی کمانڈر نے اُسے کوئی سزا نہ دی۔ سلیمان کی حالت یہ ہو گئی کہ ایک صبح پریڈ پر اُس کے ہاتھ سے رائفل گر پڑی۔ اُس سے باز پُرس ہوئی تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُسے اب حوالداری کی ترقی ملنے والی تھی۔ فوج کے سٹینڈرڈ کے مطابق وہ حوالداری کے لئے فِٹ نہیں رہ گیا تھا لیکن کمپنی کمانڈر اُس کی طرف داری کرتا تھا۔ سلیمان نے محاذ پر اپنے جوہر دکھاتے تھے، ان سے کمپنی کمانڈر بہت متاثر تھا۔ وہ شاید اسی شک میں پڑ گیا تھا کہ نائک سلیمان کو کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے —— سلیمان نے اُسے اصل وجہ نہیں بتائی تھی۔

سلیمان نے مجھے وجہ بتا دی۔ میں نے اُس سے نفسیاتی علاج کے مطابق کچھ ایسی باتیں پوچھیں جو اُس کے لئے تو ویسے ہی ہوں گی لیکن میں انہیں بہت اہم سمجھتا تھا۔ میں نے اُس کے اس وہم کی طرف توجہ نہ دی کہ اُس پر کسی نے تعویذ کئے ہوتے ہیں۔ اس وہم کو میں نے الگ نوٹ کر لیا۔ وہم بھی نفسیاتی مرض بن جایا کرتا ہے۔

اس کے مرض کے دو باعث میرے دماغ میں آتے۔ ایک یہ کہ اُس کو جنگ میں زیادہ عرصہ رہنا پڑا۔ اس کا اُس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا۔ چھاؤنی میں آکر بھی یہ اثر قائم رہا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا تھا کہ وہ خوابوں میں زیادہ تر جنگ دیکھتا ہے۔ اُس کے اردگرد گولے پھٹتے ہیں۔ ہوائی جہاز بم پھینکتے ہیں اور اُس کے ساتھی بُری طرح زخمی ہو کر مرتے ہیں۔

اس سے مجھے یہ ثبوت ملا کہ جنگ کی خوفناکی اس کے ذہن لاشعور میں اُتر گئی ہے اور اس سے اُس کے اعصاب کمزور ہوتے ہوتے اس کی جسمانی کمزوری کا باعث بن گئے۔ اعصاب زیادہ کمزور ہو جائیں تو دل پر ایسا خوف بیٹھ جاتا ہے جو جسم کو بیکار کر دیتا ہے اور دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس مریض کی اس حالت کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی جنگِ عظیم کے محاذوں سے فوجی جب پیچھے آتے تھے تو وہ سب سے پہلے گندی پیشہ ور عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ کلکتہ برما کے محاذ کے پیچھے بہت بڑا شہر تھا۔ محاذ کی طرف جانے والی اور واپس آنے والی فوجیں کلکتہ میں قیام کرتی تھیں۔ وہاں پیشہ ور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ وہ کئی بیماریوں کے جراثیم کی حامل تھیں۔ بعض فوجی ان سے کوئی نہ کوئی بیماری وصول کر لیتے تھے۔ میں نے نائک سلیمان سے پوچھا تو اُس نے انکار کیا اور قسمیں کھائیں کہ وہ ایسا آدمی ہرگز نہیں۔ میں نے اُس کے انکار کے باوجود اُس کا ضروری معائنہ کروایا اور خون اور پیشاب بھی ٹیسٹ کرایا۔ میں نے اُسے دوسرے دن آنے کو کہا۔

دوسرے دن اُس کے ٹیسٹوں کی رپورٹیں مل گئیں جو بالکل ٹھیک تھیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس پر کسی تعویذ کسی کالے یا سفید جادو کا اثر

نہیں۔ یہ اثر جنگ کا ہے۔ میں نے ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں سمجھایا کر وہ سمجھ گیا۔ میں نے نسخہ لکھ کر اُسے ہسپتال سے دوائیاں دلا دیں۔ یہ اعصابی طاقت کی دوائیاں تھیں۔ اُس زمانے میں آج والی دوائیاں نہیں تھیں جو ذہن کو سکون دیتی ہیں۔ نیند کی گولیاں تھیں۔ میں نے ایک ہفتے کے لئے اُسے یہ گولیاں بھی دیں تاکہ وہ گہرا سوتے۔

چونکہ میں نے لکھ دیا تھا کہ اُسے ایک ہفتے بعد میرے پاس پھر بھیجا جاتے اس لئے اُسے پھر میرے پاس بھیجا گیا۔ اُس کی رپورٹ نے مجھے مایوس کیا۔ اُس کی حالت اگر بگڑی نہیں تو ذرا سی بھی بہتر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ٹیلیفون پر اُس کے کمپنی کمانڈر سے پوچھا کہ اپنے کام میں اب یہ کیسا ہے۔ اُس کی رپورٹ مایوس کُن تھی۔ میں نے انسانی جذبے کے تحت سوچا کہ یہ انگریز میجر ایک ہندوستانی نائک پر کب تک مہربان رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تنگ آ کر سلیمان کو میڈیکل بورڈ میں بھیج کر گھر بھجوا دے گا۔ اس کے علاوہ سلیمان کی ترقی کا بھی سوال تھا۔

میں نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوتے سلیمان کو ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ذہنی مریضوں کے وارڈ میں تھوڑے سے مریض تھے۔ میں ہر ایک کو اطمینان سے توجہ دے سکتا تھا۔ سلیمان کو میں نے اپنے مشاہدے اور علاج میں رکھا۔ پندرہ دنوں بعد وہ بہتر محسوس کرنے لگا۔ میں نے مزید دس بارہ دن اُسے ہسپتال میں رکھا اور جب اُسے ہسپتال سے نکالا تو لکھ دیا کہ اسے ایک ماہ کی چھٹی دی جاتے اور جب واپس آتے تو اسے میرے پاس معائنے کے لئے بھیجا جاتے۔

وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد میرے پاس آیا۔ اُس کی رپورٹ وہی تھی جو پہلے روز تھی۔ اب بھی وہ اپنی بیوی کے لئے بیکار ثابت ہُوا اور اُس کے دل پر خوف پہلے سے زیادہ تھا۔ اُس نے خودکشی کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ اب اُسے یقین تھا کہ اُس پر کسی نے تعویذ کئے ہوتے ہیں۔ میں اُس کا یہ وہم نہیں مانتا تھا۔ اُس کا یہ وہم اس کے پیر کے علاوہ کسی ایسے آدمی

نے بھی پکا کر دیا تھا جو اس قسم کے تعویذ دیا کرتا تھا۔

میں نفسیات کا ڈاکٹر تھا۔ میرا طریقہ نبض دیکھنا اور ٹوٹی لگانا نہیں تھا۔ میں نے تو اُس کے ذہنِ لاشعور میں سے کچھ نکالنا تھا۔ اب اُس نے دو تین ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے شک ہُوا کہ اس پر جنگ کا اثر نہیں۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ میں نے اپنے طریقے سے اُس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اُس نے ایک پردہ اُٹھا دیا۔

”صاحب!“ — اُس نے کہا — ”میں نے اس چھٹی کے دوران اپنی آزمائش کی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ازدواجی زندگی کے لئے فِٹ ہوں لیکن میں جب اپنی بیوی کے پاس جاتا ہوں تو میرا جسم برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے اور میرے دل پر خوف آ جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بیوی جب مجھے دیکھتی ہے تو میرا پسینہ نکل آتا ہے اور میں اپنی بیوی سے آنکھ نہیں ملا سکتا“ — اُس نے یہ بھی کہا — ”میں جب بیوی سے دُور ہوتا ہوں تو مجھے کچھ سکون ملتا ہے۔“

یہاں مجھے کچھ اور شک ہُوا۔ وہ کسی ایسے خوف PHOBIA میں مبتلا تھا جس کا تعلق اُس کی بیوی کے ساتھ تھا۔ مجھے اُس کے دو تین تجربے سُن کر یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے خاوند بننے کے قابل ہے۔ پیچھے کوئی خوف رہ گیا تھا جس کا میں نے سراغ لگانا تھا۔ میں نے اُس پر اتنے سوال کئے کہ جواب دے دے کر اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں نے اُسے پانی پلایا۔ میں خاص طور پر بتاتا ہوں کہ میں تھانیداروں کی طرح تفتیش نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ملزم سمجھنے لگتا۔ نفسیات کے ڈاکٹر کا انداز بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ میرے انداز میں دوستی کا رنگ بہت ہی صاف تھا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ کوئی بات ایسی ہے جو وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

”کیا تم اس جہنّم سے نہیں نکلنا چاہتے جو تم نے اپنے لئے بنا رکھا ہے؟“ — میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا — "اگر میں اصل بات بتا دوں تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ آپ میجر صاحب ہیں۔"

"میں ڈاکٹر ہوں" — میں نے کہا — "یہ تو فوج نے مجھے رینک دے دیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر سمجھو، میجر نہ سمجھو۔"

وہ تھوڑی دیر تک ڈرتا رہا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے عذاب سے نکالوں گا، کسی اور عذاب میں نہیں ڈالوں گا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کی مدد کرنے والا مسلمان ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں اس کوشش میں ہوں کہ اُسے جلدی ٹھیک کر دوں تاکہ اُسے ترقی ملے جو اُس کی بیماری کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔

"میری بیماری کا علاج آپ کے پاس نہیں میجر صاحب!" — اُس نے کہا۔

"مجھے میجر نہ کہو ڈاکٹر کہو" — میں نے کہا — "تم نے دل میں جو کچھ بھی چھپا رکھا ہے وہ مجھے بتا دو۔ میں اپنی کوشش کروں گا۔ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"میں نے اس لڑکی کو جو میری بیوی ہے، بڑے غلط طریقے سے حاصل کیا ہے" — اُس نے کہا — "یہ غلط طریقہ فوجی قانون کے مطابق جرم ہے .... اس لڑکی کی منگنی ایک سپاہی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ سپاہی میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میری برادری کا تھا اور وہ میری بٹالین کا تھا۔ اگر وہ بٹالین کی کسی اور کمپنی میں ہوتا تو مجھے یہ جرم کرنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ میری کمپنی میں اور میری پلاٹون میں تھا....

"اس لڑکی کی شادی میرے ساتھ ہونی تھی یا اس سپاہی کے ساتھ۔ برادری میں تیسرا لڑکا کوئی نہیں تھا۔ اگر اس سپاہی کو رشتے سے جواب مل جاتا تو رشتہ کوشش کے بغیر بھی مجھے مل جاتا۔ رشتہ اس سپاہی کو مل گیا۔ مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ جب رشتہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس کے مقابلے میں برادری کی اور کوئی لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی....

"جب اس رشتے کا فیصلہ ہوا، اُس وقت ہماری بٹالین برما فرنٹ پر تھی۔ سپاہی بٹالین میں تھا اور میں چھٹی پر تھا۔ لڑکی اپنے گاؤں اور اپنی برادری کی تھی۔ میرے ساتھ اُس کی دُور کی رشتہ داری بھی تھی۔ میری چھٹی کا آخری دن تھا۔ وہ مجھے کھیتوں میں اکیلی مل گئی۔ میں نے اُسے منگنی کی مبارک دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے اُس کے رشتے کے لئے خانقاہوں پر منتیں مانی ہوتی تھیں لیکن خدا نے میری کوئی منت قبول نہیں کی۔ اُس نے تھوڑا سا شرما کر کہا — 'یہ تو بڑوں کا فیصلہ ہے، میں کیا کر سکتی ہوں میرا کیا ہے۔ میرے لئے تو تم دونوں ایک جیسے ہو' — میں نے اُسے مذاق میں ایک بات کہی تو وہ ہنس پڑی اور اُس نے کہا — 'خدا اُسے زندگی دے۔ جب تک وہ زندہ ہے، منگنی تو نہیں ٹوٹ سکتی۔ وہ جب بھی چھٹی آیا، شادی ہو جائے گی'....

"میں دوسرے دن گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ یہ لڑکی میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی .... میں اپنی بٹالین میں پہنچ گیا۔ ایسے سمجھ لیں کہ میں جہنم میں پہنچ گیا جہاں انسان جل رہے تھے۔ اتنی زبردست اور ایسی ظالم لڑائی تھی کہ زمین اور آسمان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک ایک منٹ کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ جاپانی فوج بھاگ رہی ہے، پھر بھی جاپانی بڑی سخت لڑائی لڑ رہے تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے مہینے گزر گئے تھے۔ دن اور رات کا فرق ختم ہو گیا تھا....

"ہماری دو ڈیوٹیاں بہت خطرناک تھیں۔ ایک پٹرول ڈیوٹی تھی اور دوسری ریکی تھی یعنی چھُپ کر آگے جانا اور دشمن کو دیکھنا۔ پٹرول ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ اس میں بھی دشمن کے قریب جانا پڑتا تھا .... برما کا علاقہ پہاڑی ہے اور جنگل بھی ہیں۔ ہماری بٹالین جس علاقے میں تھی، وہ بھی پہاڑی علاقہ تھا لیکن جنگل نہیں تھا۔ ہمارے مورچے پہاڑیوں پر تھے۔ جاپانیوں کے مورچے سامنے والی پہاڑی پر تھے۔ ریکی پٹرول یا فائٹنگ پٹرول کے لئے نیچے جانا پڑتا تھا....

”ایک روز میری سیکشن کو دن کی پٹرول (گشتی) ڈیوٹی دی گئی۔ میرے ساتھ بارہ جوان تھے اور ان میں وہ سپاہی بھی تھا جس کے ساتھ اُس لڑکی کی منگنی ہوئی تھی جو مجھے اچھی لگی تھی۔ یہ سپاہی پہلے بھی میرے ساتھ پٹرول ڈیوٹی پر گیا تھا۔ وہ میری سیکشن میں تھا۔ دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے خود کمپنی صوبیدار کو کہا تھا کہ اس سپاہی کو میری سیکشن میں کر دیں کیونکہ یہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اُس کا خیال رکھتا....

”وہ تو چھاؤنی کا معاملہ تھا۔ اب ہم جنگ میں بڑے خطرناک فرنٹ پہ تھے۔ وہاں میں اُس کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ ایک روز وہ میرے ساتھ پٹرول ڈیوٹی پہ گیا تو مجھے اُس کی منگیتر یاد آ گئی۔ شاید کئی مہینے اس خوفناک جنگ میں رہ کر میرا دماغ کمزور ہو گیا تھا۔ مجھے وہ لڑکی اتنی یاد آئی کہ میرے دل پر بہت بُرا اثر ہوا۔ مجھے اُس لڑکی کے یہ الفاظ یاد آتے — ’جب تک وہ زندہ ہے منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔ وہ جب چھٹی آیا، شادی ہو جائے گی‘....

”میرے دل سے دعا نکلی کہ یہ سپاہی مر جائے۔ میری بٹالین کے دو سو سے زائد آدمی مارے جا چکے تھے۔ اگر یہ مر جاتا تو کیا ہو جاتا۔ مجھے اپنے اُوپر قابو نہ رہا۔ میں ان بارہ جوانوں کو ساتھ لے کر ٹیکری سے اُتر گیا اور نیچے جا کر انہیں پٹرول کی ترتیب میں تقسیم کر دیا۔ ہم نے جدھر جانا تھا اُدھر گئے اور پٹرول پارٹیاں جو کام کرتی ہیں وہ ہم نے کیا۔ میرے دل میں بڑا خطرناک ارادہ آ گیا۔ میں نے اپنے گاؤں کے سپاہی کو ایک سپاہی کے ساتھ آگے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ارادہ یہ کیا کہ چھپ کر پیچھے سے اپنے گاؤں کے سپاہی کو گولی مار دوں۔ ہمارے اُوپر سے دونوں طرفوں کی گولیاں گزر رہی تھیں۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میری سیکشن پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں جگہ جگہ کسی اوٹ میں پوزیشن لینی پڑتی تھی۔ میں نے اس ڈر سے اپنا ارادہ بدل دیا کہ کوئی دیکھ لے گا اور مجھے قتل کی سزا ملے گی....

”ارادہ پھر دل میں آ گیا۔ میں نے ایک اور طریقہ سوچا۔ وہ سپاہی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آگے تھا۔ میں ایک ٹیکری کے پیچھے جا کر آگے چلا گیا اور اُس سپاہی تک پہنچا۔ میں نے اُن دونوں کو کہا کہ وہ اوٹ میں رہ کر آگے چلے جائیں اور جہاں ٹیکری ختم ہوتی ہے وہاں سے دائیں کو اُتر جائیں.... میں نے انہیں اس سے بھی آگے چلے جانے کو کہا۔ میں ان کا کمانڈر تھا۔ انہیں ہر کام میرے حکم سے کرنا تھا۔ میں اس علاقے میں پہلے آ چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کس جگہ سے آگے نہیں جانا۔ اس سے آگے جو جگہ تھی، وہ دشمن کی ان پوزیشنوں سے صاف نظر آتی تھی جو ٹیکریوں پر تھیں۔ اس سے پہلے ہماری ڈی کمپنی کے دو جوان وہاں مارے گئے تھے....

”میں اپنی پسند کی لڑکی کے منگیتر کو اکیلا اُدھر نہیں بھیج سکتا تھا۔ اگر اکیلا بھیجتا تو اس کا جوڑی دار (اُس کے ساتھ کا سپاہی) سب کو بتا دیتا کہ وہ جوان میرے حکم سے آگے گیا تھا۔ ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ میں انہیں جہاں بھیج رہا ہوں وہاں وہ مارے جائیں گے.... وہ دونوں چلے گئے۔ میں ٹیکری کے ساتھ ساتھ پیچھے آ گیا اور اپنے چار سپاہیوں کے پاس پہنچ گیا جو ایک جگہ پوزیشن لے کر بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آگے والے دو جوانوں کو دیکھنے گیا تھا لیکن دونوں وہاں نہیں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ آگے نہ چلے گئے ہوں....

”میں وہاں سے ایک اور جگہ چلا گیا جہاں میرے دو سپاہی پوزیشن میں تھے۔ ان کو بھی میں نے ایسے ہی کہا جیسے چار سپاہیوں کو کہا تھا۔ وہاں سے میں پھر آگے گیا تو ہمارے قریب سے ایک مشین گن فائر ہوئی۔ یہ میرے دو سپاہیوں پہ فائر ہوتی ہو گی۔ میں نے انہیں بھیجا ہی ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ زندہ آ ہی نہیں سکتے تھے....

”میں پٹرول پارٹی کو شام کے وقت واپس لایا۔ واپس کمپنی ہیڈکوارٹر میں آ کر میں نے رپورٹ دی کہ دو سپاہی میرے خبردار کرنے کے

باوجود خطرناک علاقے میں چلے گئے تھے اور مارے گئے ہیں۔ میں نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ میں نے آگے جا کر دونوں کی لاشیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن آگے جانا خطرناک تھا۔ وہ یقیناً مارے گئے ہیں....

"مجھے اڑھائی تین گھنٹے پہلے واپس آجانا تھا لیکن میں نے کمپنی ہیڈکوارٹر میں یہ رپورٹ دی کہ میں لاشیں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میں نے دراصل وہاں اڑھائی تین گھنٹے اس وجہ سے زیادہ لگا دیتے تھے کہ وہ دونوں سپاہی اگر زندہ ہیں تو واپس آجائیں گے۔ وہ اتنی دیر تک نہ آئے تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مارے گئے ہیں۔"

پھر نائک سلیمان نے بتایا کہ دونوں سپاہیوں کے گھروں کو فوجی ہیڈکوارٹر کی طرف سے سرکاری اطلاع چلی گئی ہوگی کہ وہ جنگ میں مارے گئے ہیں۔ سلیمان نے وہیں سے اپنے گھر خط لکھا کہ فلاں سپاہی جنگ میں مارا گیا ہے۔ پندرہ بیس دنوں بعد اُسے گھر سے جواب ملا کہ سرکاری چٹھی آچکی ہے۔ سلیمان نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اللہ کو ایسے ہی منظور تھا کہ وہ سپاہی مارا گیا ہے۔ اب لڑکی کے ماں باپ سے لڑکی کا رشتہ مانگ لیں۔ ایک مہینے بعد سلیمان کو باپ کا خط ملا کہ لڑکی والوں نے رشتہ دے دیا ہے اور وہ جب بھی چھٹی آئے گا، شادی کر دی جائے گی۔

نائک سلیمان نے اپنے رقیب کو ایسے طریقے سے مروایا تھا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ دو تین مہینے بعد اس کی بٹالین کو جبل پور بھیج دیا گیا۔ جاپانی بُری طرح پسپا ہو گئے تھے۔ پہلے سنا چکا ہوں کہ نائک سلیمان چھٹی گیا اور اس کی شادی اُسی لڑکی کے ساتھ ہو گئی جسے وہ دل سے چاہتا تھا لیکن اُس نے اب مجھے بتایا کہ دلہن کو دیکھ کر اُسے ہو کیا گیا تھا۔ پہلے اُس نے یہ راز مجھے نہیں بتایا تھا۔

"میں نے بڑے شوق سے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُس نے اپنا چہرہ اُوپر کیا تو مجھے کمرے میں کوئی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ دروازہ کھلا ہُوا تھا اور دروازے میں وہ سپاہی کھڑا تھا۔ وہ مجھے صرف ایک سیکنڈ کے لئے نظر آیا۔ پھر دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور سپاہی وہاں نہیں تھا۔ میرا جسم سرد ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ وہم تھا لیکن یہ وہم تھا یا جو کچھ تھا، اس نے مجھے مُردہ کر دیا۔ میرے دل پر خوف چھا گیا....

"میں نے لالٹین بجھا دی لیکن بیوی کا جسم مجھے اتنا سرد لگا جیسے یہ اس کے پہلے منگیتر کی لاش ہو۔ میں اور زیادہ سرد ہو گیا.... پھر ہر رات ایسے ہی ہوتا رہا۔ میری بیوی نے چوتھے پانچویں دن مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میرے مُنہ سے یہی نکلا کہ کسی دشمن نے تعویذ کر دیئے ہیں۔"

سلیمان نے مجھے ایک ایک منٹ کی روئیداد سنائی۔ اُس نے تین چار مرتبہ اندھیرے کمرے میں اپنی بیوی کے پہلے منگیتر کو دیکھا۔ منگیتر دو تین سیکنڈ بعد غائب ہو گیا۔ اس مرے ہُوئے سپاہی کی ماں سلیمان کو بار بار اپنے گھر بلاتی اور پوچھتی تھی ـــ "تم میرے بیٹے کے ساتھ تھے۔ اُس نے زخمی ہو کر پانی مانگا ہو گا۔ تم نے اُسے پانی پلایا تھا نا؟.... اُس نے آخری وقت کوئی بات کی ہو گی۔ میرا نام لیا ہو گا.... میں تو اُس کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اپنی بیوی کو دیکھ کر تمہیں اپنا دوست یاد نہیں آتا؟ وہ تمہاری بیوی کا منگیتر تھا نا!" ـــ ماں اس طرح کی ایسی جذباتی باتیں کرتی تھی جو سلیمان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اُس پر یہ اثر ہُوا کہ وہ خواب میں جنگ دیکھتا اور اس سپاہی کی لاش دیکھتا۔ وہ اُسے جاگتے ہوتے بھی دیکھتا تھا، اور جب وہ اپنی بیوی کو دیکھتا تھا تو ایسے محسوس کرتا تھا جیسے اس لڑکی کو معلوم ہو گیا ہو کہ اُس کے منگیتر کو سلیمان نے قتل کیا ہے۔

یہ دراصل ضمیر پر بڑے ہی گھناؤنے گناہ کا بوجھ تھا جس نے اُس کے جسم کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اُسے مرا ہُوا سپاہی جس طرح نظر آتا تھا یہ واہمہ تھا

جسے HELLUCINATION کہتے ہیں۔ ایک تو ضمیر پر یہ بوجھ تھا، دوسرے وہ اپنی بیوی کے لئے بیکار ثابت ہوا۔ اس کے نتیجے میں وہ ذہنی طور پر بیکار ہوگیا۔ انسان کا خون ہضم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ سلیمان کی حالت بگڑتی گئی۔

میں نے اُسے لیکچر دیا کہ وہ اپنے آپ کو یقین دلاتے کہ وہ سپاہی مر چکا ہے اور واپس نہیں آئے گا۔ جو ہو چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں اب وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ میں نے اُسے طریقے بتاتے۔ دوائیاں بھی دیں۔ اُس نے میرے آگے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اس لئے وہ کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ اس کا علاج ضروری تھا، ورنہ اس کی حالت کو روز بروز بگڑنا تھا۔ اس کا آخر انجام یہ ہونا تھا کہ سلیمان نے کسی کو قتل کر دینا یا خودکشی کر لینی تھی۔ میں نے ذہنی سکون کی دوائیوں کے علاوہ نفسیاتی طریقوں سے بھی علاج شروع کر دیا۔ اس قسم کے نفسیاتی مرض کے مریض کا علاج تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے ایک تو انسانی جذبے کے تحت اور دوسرے تجربے کے طور پر اُس کا علاج شروع کیا تھا۔

اُسے کبھی تین چار دنوں کے لئے ہسپتال میں رکھا اور کبھی اُسے کھلی چھٹی دی کہ بارک میں رہے۔ میری سفارش پر اُسے ہلکی پھلکی ڈیوٹی دی جاتی تھی۔ اس کا کمپنی کمانڈر اُس میں دلچسپی لیتا تھا۔ اُسے میں نے بتایا کہ سلیمان کی بیماری کا باعث یہ ہے کہ اس نے بڑی ہولناک جنگ دیکھی ہے اور اُس نے وہاں اپنی طاقت اور برداشت سے بڑھ کر کام کیا ہے جس سے اس کے اعصاب مجروح ہو گئے ہیں۔ کمپنی کمانڈر اسی لئے سلیمان کو پسند کرتا تھا کہ وہ اپنی طاقت اور برداشت سے بڑھ کر کام کیا کرتا تھا۔

میں نے بیماری کا یہ باعث ایک اور وجہ سے بھی لکھا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے تحت سوچا تھا کہ سلیمان اگر ٹھیک نہ ہو سکا تو اُسے

میڈیکل بورڈ فوج کے لئے "اَن فِٹ" قرار دے دے گا۔ بورڈ جب بیماری کا باعث جنگ لکھے گا تو اسے اچھی پنشن مل جائے گی۔ وہ دراصل قاتل تھا لیکن میں اُسے سزا دینے والا جج نہیں، میں ڈاکٹر تھا۔

ایک روز سلیمان خود ہی میرے پاس آگیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بات کرتے اُس کی زبان اس کے کنٹرول میں نہیں آتی تھی۔ اُس روز اُس نے میرے پاس نہیں آنا تھا۔ کوئی خاص وجہ ہو گی۔ اس نے جب وجہ بتائی تو میں بھی حیران ہوگیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا — "میری بیوی کا منگیتر سپاہی جو میں کہتا تھا کہ مارا گیا تھا، واپس آگیا ہے۔ مجھے گھر سے خط ملا ہے۔ وہ رجمنٹل سنٹر میں ہے۔ سنٹر سے اُس کے گھر والوں کو سرکاری اطلاع گئی ہے کہ اُن کا بیٹا بڑی بہادری سے جاپانیوں کی قید سے فرار ہو کر آگیا ہے .... میں بہت گھبرا رہا ہوں۔ رات کو میں سویا بھی نہیں۔ وہ بتا چکا ہو گا کہ میں نے اُسے آگے بھیجا تھا۔ میں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ وہ خود غلطی سے آگے چلا گیا تھا۔"

میں نے اُسے کچھ باتیں بتائیں، ذہنی سکون کی گولیاں دیں اور اُسے کہا کہ کوئی اور بات یا واقعہ ہو جائے تو مجھے بتانے آجایا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ سپاہی بیان دے چکا تھا کہ نائک سلیمان نے اُسے فلاں مقام تک جانے کو کہا تھا اور اس غلط حکم کی پاداش میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی بھی تو میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ البتہ یہ کیس اب میرے لئے ایک ڈرامے کی طرح دلچسپ ہو گیا تھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوا ہے۔

آگے یہ ہوا کہ سات آٹھ دنوں بعد وہ سپاہی رجمنٹل سنٹر سے بٹالین میں آگیا۔ نائک سلیمان نے میرے پاس آکر پورا واقعہ سنایا۔ وہ

اب ذرا سکون میں تھا۔ اُس نے مجھے اس طرح سنایا کہ یہ سپاہی بٹالین میں آیا تو نائک سلیمان سے گلے لگ کر ملا اور اُس نے سلیمان سے کوئی شکایت نہ کی کہ سلیمان نے اُسے اتنی خطرناک جگہ بھیج دیا تھا۔ اُس نے سلیمان کو بتایا کہ اُس نے سنٹر میں یہ بیان دیا تھا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی پٹرول پارٹی سے آگے نکل گیا تھا۔ یہ سُن کر سلیمان کو سکون آ گیا۔ بٹالین میں آ کر اپنے کمپنی کمانڈر اور بٹالین کمانڈر کو بھی اُس نے یہی بیان دیا تھا۔

اس سپاہی پر جو گزری، وہ یوں تھی کہ وہ نائک سلیمان کے حکم سے اپنے ساتھی کے ساتھ خطرے کے مقام پر چلا گیا۔ قریب سے ہی مشین گن فائر ہوئی۔ دونوں بچ گئے اور رینگ کر اوٹ میں ہو گئے۔ مشین گن پھر فائر ہوئی۔ وہ دونوں رینگتے ہوئے نکلے۔ مشین گن ایک بار پھر فائر ہوئی۔ اس سپاہی کا ساتھی مارا گیا اور اُس نے اُٹھ کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ جاپانی بہت قریب تھے۔ وہ اُسے پکڑ کر لے گئے۔ اُسے پیچھے بھیجنا تھا لیکن جاپانیوں کی پوزیشن اب بہت کمزور ہو چکی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

اس سپاہی کو جاپانیوں نے اپنے ساتھ رکھا۔ اسے انہوں نے کوئی تکلیف نہ دی، بلکہ اسے اچھی طرح رکھا۔ سبھاش چندر بوس نے انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں کی جو انڈین نیشنل آرمی بنائی اور اسے جاپان کی فوج کے ماتحت کر دیا تھا، اس کو بھی اسی میں شامل کر دیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس سپاہی کو انڈین نیشنل آرمی (آئی۔ این۔ اے) میں شامل کرنے کی وجہ سے جاپانیوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔

وہ نو دس دن جاپانیوں کی اسی بٹالین کے ساتھ رہا۔ یہ بٹالین یہ پوزیشن چھوڑ کر پیچھے چلی گئی۔ اِدھر سے انگریزوں کے حملے بہت سخت ہو گئے۔ جاپانی فوج افراتفری میں پسپا ہو رہی تھی۔ اس بھگدڑ میں سپاہی کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں چونکہ اس سپاہی سے نہیں ملا تھا اس لئے میں

اُس کے فرار کی ساری روئیداد نہیں سُنا سکتا۔ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ برما کے پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آنا بہت ہی مشکل کام تھا۔

یہ سپاہی وادیوں اور جنگلوں میں بیس بائیس روز بھٹکتا رہا اور کہیں سے کہیں جا نکلا۔ اب جاپانیوں کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اُسے کسی پہاڑی کی چوٹی سے فوجیوں نے دیکھ لیا۔ وہ غالباً سگنل والوں کی پوسٹ تھی۔ اُسے اُوپر لے گئے۔ بہت دنوں بعد اُسے پیچھے بھیجا گیا۔ اُس کی جسمانی حالت بہت بُری تھی۔ دو مہینوں بعد اُسے کلکتہ پہنچایا گیا۔ کئی روز وہ ہسپتال میں رہا۔ وہاں سے اُسے اُس کے رجمنٹل سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اُسے پھر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ایک مہینہ بعد ہسپتال سے اُسے اس سفارش کے ساتھ فارغ کیا گیا کہ اسے کم از کم ایک مہینے کی چھٹی پر بھیجا جائے۔ اب وہ اپنی بٹالین میں آ گیا تھا اور بٹالین کمانڈر نے اُسے ایک کی بجائے ڈیڑھ مہینے کی چھٹی دے دی تھی۔

نائک سلیمان میرا مستقل مریض بھی تھا اور میرا دوست بھی بن گیا تھا۔ اُسے دوست بنانا علاج کا حصہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ سپاہی چھٹی چلا گیا ہے۔ سلیمان کی ذہنی حالت ذرا اور بگڑ گئی تھی۔ اُس کا چہرہ بھی کمزور ہو گیا اور اُس کی حالت کبھی کبھی نیم پاگلوں جیسی ہوتی تھی۔

پندرہ سولہ دنوں بعد وہ میرے پاس آیا تو اُس کی حالت اور ہی زیادہ خراب تھی۔ وہ بات کرتے کرتے چُپ ہو گیا اور ویسے ہی کہیں نظریں جما دیں۔ میں نے اُسے بیدار کیا۔ اُس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے لفافے سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ اُس کے باپ کا خط تھا۔ لکھا تھا کہ تم چھٹی لے کر آؤ اور اپنے گھر کو دیکھو۔ تمہاری بیوی نے ہمارے خاندان کی ناک کاٹ دی ہے۔ وہ اپنے پہلے منگیتر (سپاہی) سے ملتی ہے اور دو عورتوں نے انہیں کھیتوں سے آگے ایک گہری جگہ بڑی بے شرمی کی حالت میں دیکھا ہے۔ گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ سلیمان کی بیوی اپنے پہلے منگیتر کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔

خط میں سلیمان کو بھڑکایا گیا تھا کہ وہ آئے اور اس سپاہی کا بندوبست کرے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا بندوبست کرے گا؟ اُس نے کہا کہ اُن کے علاقے میں اس جرم کی سزا قتل ہے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے، ورنہ اُس کی ذہنی حالت بگڑتی جائے گی اور وہ کسی روز پاگل ہو جائے گا، لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کا ارادہ خطرناک لگتا تھا۔

وہ چلا گیا اور کوئی ڈیڑھ ہفتہ بعد میرے پاس آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اب صحیح طریقے سے بولتا تھا اور وہ بالکل نارمل لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ رونق بھی تھی اور وہ مُسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا کہ پکا بندوبست کر آیا ہوں۔

”دونوں کو قتل کیا ہے یا ایک کو؟“ — میں نے پوچھا۔

”کسی کو بھی نہیں“ — اُس نے کہا — ”میں قتل کا ہی ارادہ لے کر گیا تھا میں بیمار تھا، چاہے کمزور تھا، عورت کی کیا مجال کہ اپنے دل کی مرضی کرتی پھرے اور یارانے لگاتے؟ .... میں نے کمپنی صوبیدار اور کمپنی کمانڈر کی منت کر کے دس دنوں کی چھٹی لی تھی۔ میں واپس آنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ میں نے قتل کرنا اور گرفتار ہونا تھا۔ میں شام کے بعد اپنے گاؤں پہنچا۔ رات کو بیوی کو الگ کر کے پوچھا کہ اس بات میں کتنی سچائی ہے کہ تم نے اپنے پہلے منگیتر کے ساتھ تعلق جوڑ لیا ہے .... ڈاکٹر صاحب! میں خونخوار اور وحشی بن کر گیا تھا لیکن جب بیوی تنہائی میں میرے سامنے آئی تو میری خونخواری ختم ہو گئی اور دل پر خوف آ گیا۔ میں نے بہت ہمّت کر کے اُسے یہ الفاظ کہے تھے جو آپ کو بتائے ہیں....

”مجھے یہ امید تھی کہ وہ کہے گی کہ یہ سب جھوٹ ہے، لیکن اُس نے پہلے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اُس کے ہونٹوں پر کچھ اور ہی طرح کی مسکراہٹ تھی۔ میری نظریں نیچی ہو گئیں۔ اُس نے کہا — طلاق دے دو چاہے میرا گلا دبا دو، جھوٹ نہیں بولوں گی۔ تم جسمانی طور پر صحیح نہیں ہو۔ میں نے یہ برداشت کر لیا تھا۔ تمہارے دماغ پر بھی کوئی اثر ہے۔ میں نے یہ بھی قبول کر لیا تھا لیکن تم بُزدل ہو۔ تم میں مردوں والی جرأت بھی نہیں۔ مزہ تو جب تھا کہ تم اُسے (پہلے منگیتر کو) جوانمردوں کی طرح قتل کرتے اور پھر میرے ساتھ شادی کرتے۔ تم نے اُسے اس طرح مروانے کی کوشش کی کہ اُسے جاپانیوں کے سامنے دھوکے سے بھیج دیا اور خود وہاں سے بھاگ آئے اور اپنے افسروں کو کہا کہ وہ غلطی سے آگے چلا گیا تھا اور مارا گیا ہے،....

”ڈاکٹر صاحب! میں تو زندہ لاش بن گیا۔ میری زبان بند ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میری بیوی کو اسی سپاہی نے یہ بات بتائی ہے۔ وہ ابھی گاؤں میں چھٹی گزار رہا ہے۔ میری بیوی نے کہا — تم سے تو وہ اچھا نکلا جس نے واپس آ کر افسروں کو بتایا کہ وہ غلطی سے آگے چلا گیا تھا اور پکڑا گیا۔ اُس نے مجھے ساری بات سنائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلیمان میرا دوست ہے۔ میں نے اس کو کورٹ مارشل سے بچا لیا ہے .... اُسے پتہ چل گیا کہ تم نے کیا رپورٹ دی تھی۔ تم اُسے مروانا چاہتے تھے۔ اللہ نے اُسے بچا لیا.... کیا تم اپنے اللہ کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ .... لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ میں نے اُس کے ساتھ تعلق جوڑ لیا ہے۔ وہ میرے دل کو اچھا لگتا ہے۔ تم نے صرف اُسے ہی نہیں، اُس کی ماں کو، اُس کے باپ اور اُس کی بہنوں کو چھ مہینے رُلایا ہے۔ اُس کی ماں اور بہنیں رو رو کر اندھی ہو گئی ہیں،....

”وہ اس وجہ سے دلیری سے بول رہی تھی کہ میں اُسے قتل تو کر ہی دوں گا، پھر کیوں نہ وہ دل کا غبار نکال لے۔ میں نے یہ کیا کہ اُسے طلاق دے دی اور رات کو ہی اُسے اُس کے گھر چھوڑ آیا۔ میرے ماں باپ اور میرے چچوں نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ غیرت والے مرد بے عزّتی کا بدلہ لیا کرتے ہیں، طلاق نہیں دیا کرتے۔ میں نے اُن کی گالیاں برداشت کر لیں۔ دوسرے دن میں سپاہی کو گاؤں سے باہر ملا اور اُسے گلے لگا کر بہت رویا۔ میں نے اُس سے معافی مانگی اور اُسے

کہا کہ میں نے اُس کی امانت واپس کر دی ہے۔۔۔ اُس نے لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ بات کر لی ہے۔ عدت کے دن پورے ہو جائیں گے تو اُن کی شادی ہو جائے گی۔ اب میرے دل پر کوئی خوف نہیں اور جسم میں طاقت بھی آگئی ہے۔"

* * *

ون اردو ڈاٹ کام

تولیدو کا گناہگار

ایک زمانہ تھا جب یورپ پر پادری کی حکمرانی تھی۔ پادری اپنے آپ کو خدا کا مشیر اور ایلچی سمجھتا تھا۔ عوام کو اس نے توہمات میں الجھا رکھا تھا۔ قانون پر بھی پادری کی مہر ثبت تھی۔ سپین کی یہ سچی کہانی اُسی دَور کی عکاسی کرتی ہے۔

> "جو کوئی میریا سپالنسزا نام کی جادوگرنی کا اتا پتا بتائے گا
> اسے مُردہ یا زندہ عدالت میں لے آئے گا، اسے اس کے
> تمام گناہوں کی معافی دلوائی جائے گی۔"

اس اعلان پر بارسیلونا کے بڑے پادری (بشپ) اور سپین کی عدالتِ عالیہ کے چار ججوں کے دستخط تھے اور یہ اعلان اشتہاروں کی صُورت میں سارے شہر میں پھیلا دیا گیا تھا۔ یہ اُس دَور کی بات ہے جو سپین کی تاریخ کا ہی نہیں بنی نوعِ انسان کی تاریخ کا سیاہ دَور تصور کیا جاتا ہے۔

سپین کے شہر بارسیلونا کی تمام تر آبادی نے یہ اعلان پڑھا اور میریا نامی جادوگرنی کی تلاش شروع ہو گئی۔ میریا کا جو حلیہ بتایا گیا تھا، اس حُلیے کی سولہ عورتیں پکڑی گئیں اور انہیں کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ان کے لواحقین خون کے آنسو روتے تھے۔

اُس دَور میں مرد اس بے بنیاد اور جاہلانہ عقیدے پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ بعض عورتیں ڈائنیں یا جادوگرنیاں WITCHES بن جاتی

Scanned b iqbalmt

ہیں یعنی وہ کالے علم کی عامل ہوتی ہیں اور یہ بھی کہ ایسی عورتیں اپنے آپ کو بلی، کُتا یا کوئی اور درندہ بنا سکتی ہیں۔ عموماً سیاہ رنگ کا درندہ۔ لوگ یہاں تک مانتے تھے کہ کسی شکاری پر درندے نے حملہ کیا تو اس نے درندے کو مار دیا اور درندے کا ایک پنجہ کاٹ کر یادگار کے طور پر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ یہ پنجہ درندے کا نہیں بلکہ اس کی اپنی بیوی کا ہے۔

اس اعلان کا اثر تو یہ ہُوا کہ سولہ بیگناہ عورتیں قید میں ڈال دی گئیں اور دوسرا اثر یہ ہُوا کہ لوگوں نے بارسیلونا کی تمام تر کالی بلیاں اور کالے کُتے ہلاک کر ڈالے مگر ان میں سے کسی نے بھی میریا کی جُون نہ بدلی۔

میریا بارسیلونا کے ایک سوداگر کی بیٹی تھی۔ یہ سوداگر فرانسیسی تھا۔ اُس نے سپین کی ایک عورت سے شادی کی تھی جس کے بطن سے میریا پیدا ہوئی تھی۔ میریا بہت ہی خوبصورت اور خوش باش لڑکی تھی۔ اس کا حسن فرانسیسی اور جسم ہسپانوی تھا۔ بیسویں سالگرہ تک وہ بچوّں کی طرح خوش و خرم رہی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بیگانہ تھیں۔ اُس کا ہنستا مسکراتا حُسن دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیتا تھا۔

بیسویں سالگرہ کے روز ہی اُس نے سپین کے ایک خوبرو آدمی سپالنزا کے ساتھ شادی کر لی اور میریا سے میریا سپالنزا بن گئی۔ یہ شادی صرف شادی نہیں بلکہ دو دلوں اور دو روحوں کا ملاپ تھا۔ سپالنزا نے شادی کے وقت، قسم کھائی تھی کہ اگر میں میریا کو خوش نہ رکھ سکا تو خودکشی کر لوں گا اور یہ تو لوگ دیکھ ہی رہے تھے کہ سپالنزا میریا سے محبت نہیں بلکہ اس کی پوجا کرتا تھا مگر شادی اور سالگرہ کے دوسرے ہی روز میریا کی ہنسی اور مسکراہٹوں پر اداسیوں کی گھناؤنی گھٹا چھا گئی۔

میریا کی ازدواجی زندگی کے پہلے دن کی شام گہری ہو رہی تھی۔ میریا اپنے خاوند کے گھر سے ماں کے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ اس قدر مسرور تھی کہ پا پیادہ چل پڑی مگر راستہ بھول گئی۔ بارسیلونا کی گلیاں اور سڑکیں کچھ

ایسی پیچ در پیچ تھیں کہ شہر کے لوگ بھی خصوصاً عورتیں جو کبھی کبھار اکیلے باہر نکلا کرتی تھیں، راستہ بھول جایا کرتی تھیں۔ میریا بھٹکی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ سامنے سے اسے ایک نوجوان پادری آتا دکھائی دیا۔ اُس نے پادری کو روک کر پوچھا۔

”سینٹ مارک سٹریٹ کو کون سا راستہ جاتا ہے؟“

پادری نے میریا کو دیکھا اور وہ ٹھٹھک گیا۔ چاند نکل آیا تھا جس کی شفاف چاندنی میریا کے چہرے پر سیدھی پڑ رہی تھی۔ چاندنی میں میریا کی طلسماتی آنکھوں کی چمک اور زیادہ طلسماتی ہوگئی تھی۔ مسکراہٹ میں جادو کا اثر معلوم ہوتا تھا اور اس کے سیاہی مائل بھورے بال جو اس کے کندھوں پر بکھرے ہوتے تھے سحر جگا رہے تھے۔ میریا کے جسم کی ساخت ایسی کہ نوجوان پادری بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے اتنی حسین اور ایسی دل نشیں لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے بلا جھجک میریا سے کہا —— ”بڑے پادریوں اور پروہتوں کے خون کی قسم، تم کالے علم کی عامل اور جادوگرنی ہو!“

”اگر آپ پادری نہ ہوتے“۔۔۔ میریا نے مسکرا کر کہا —— ”تو میں اس کے سوا کچھ نہ کہتی کہ آپ شراب میں بدمست ہیں!“

”تم جادوگرنی بلکہ ڈائن ہو“ —— پادری نے الفاظ پر زور دے کر وثوق سے کہا اور دانت پیس کر بولا —— ”ابھی ابھی میں نے اپنے آگے آگے ایک کالے کُتے کو جلتے دیکھا تھا۔ وہ کُتا کہاں غائب ہو گیا؟ وہ تم تھیں۔ تم نے کُتے کی جُون بدل رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی تم کُتے سے اس قدر حسین لڑکی کے روپ میں بدل گئیں کیونکہ میں نوجوان ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں پچاس جادوگرنیوں کا سراغ لگا چکا ہوں۔ اب اکیاون ہو گئی ہیں۔ میرا نام آگسٹن ہے“ —— وہ میریا کے جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔

میریا نے آگسٹن کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جادوگرنیوں کا سراغرساں اور شکاری تھا۔ وہ عورتوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ مردوں کو بھی اس وجہ سے قابلِ نفرت سمجھتا تھا کہ مرد عورت کی کوکھ کی پیداوار ہیں۔ اس

موضوع پر اُس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی

میریا بھی چل پڑی۔ تھوڑی دُور گئی تو اسے چار آدمی کھڑے نظر آئے۔ ان میں آگسٹن بھی تھا۔ میریا کو کسی نہ کسی طرح راستے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ ان چار آدمیوں کے قریب سے گزر گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ وہ تیز قدم ماں کے گھر تک پہنچی۔ گھوم کے دیکھا۔ وہ چاروں آدمی واپس جا رہے تھے۔ تین روز بعد سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی میریا کے خاوند سپالنزا کے پاس آیا اور اسے حکم سنایا کہ وہ بڑے پادری یعنی بشپ کو فوراً ملے۔

سپالنزا فوراً بڑے پادری کے ہاں جا پہنچا۔ بڑے پادری نے اسے کہا —— "تمہاری بیوی جادوگرنی ہے۔"

سپالنزا کا رنگ زرد ہو گیا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ ہمارے ایک دُوربین نظر والے آدمی نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ بدروحوں اور چڑیلوں کو ہر روپ میں پہچان لیتا ہے۔ اس نے تمہاری بیوی کو کُتّے کی جُون بدلتے اور پھر تمہاری بیوی کی جُون میں لوٹتے دیکھا ہے۔"

"وہ میری بیوی ہے" —— سپالنزا نے حیران و ششدر لہجے میں کہا —— "وہ جادوگرنی یا ڈائن نہیں ہو سکتی۔"

"وہ تمہاری بیوی نہیں ہو سکتی کیونکہ اُس کی شادی شیطان کے ساتھ ہو چکی ہے" —— بڑے پادری نے وثوق اور حکم کے لہجے میں کہا —— "بدبخت انسان! تم محسوس نہیں کر سکے کہ تم ایک بدرُوح کے جال میں پھنس گئے ہو ..... گھر جاؤ اور اسے فوراً یہاں لے آؤ۔"

بڑا پادری عالم فاضل تھا۔ اس نے بھی اپنے علم کے زور سے ثابت کر رکھا تھا کہ عورتیں قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں کیونکہ اُن کا یقین اور عقیدہ متزلزل ہوتا ہے۔ سپالنزا سر تھامے ہوتے ناگفتہ ذہنی کیفیت میں گھر آیا۔ اُس کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ وہ کس طرح ثابت کرے کہ میریا جادوگرنی یا ڈائن نہیں ہے؟ اور کون تسلیم کرے گا کہ پادری جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے؟ اب تو بارسیلونا

کی تمام تر آبادی کہنے لگی کہ میریا جادوگرنی ہے جسے صحیح الفاظ میں لوگ ڈائن کہتے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا سپین جاہل اور احمق ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی جاہل اور احمق کی کھوپڑی میں عقل کی بات ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔ سپالنزا کو اس کے باپ نے بھی مرتے وقت کہا تھا کہ ہسپانویوں سے زیادہ جاہل لوگ کہیں بھی نہیں ملتے۔ اس کا باپ ڈاکٹر تھا۔ سپالنزا کو اپنے باپ کے یہ الفاظ یاد تھے —— "بیٹا! ان لوگوں کے ساتھ میل جول نہ رکھنا اور ان پر بھروسہ بھی نہ کرنا" —— مگر سپالنزا کو اپنے ہم وطنوں پر بھروسہ تھا جو اب متزلزل ہونے لگا تھا۔ وہ بھی اس عقیدے کو مانتا تھا کہ عورتیں ڈائنیں بن جاتی ہیں لیکن بڑھاپے میں، جوانی میں نہیں۔

اس نے میریا سے کہہ ہی دیا —— "میریا! پادری تمہیں زندہ جلانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں جادوگرنی کہہ رہے ہیں، اور تمہیں معبد میں بُلا رہے ہیں۔ میری عزیز رفیقہ! اگر تم واقعی جادوگرنی یا ڈائن ہو تو خدا تم پر رحم کرے۔ اپنے آپ کو کالی بلّی میں تبدیل کر کے کہیں بھاگ جاؤ۔ تم جو کچھ بھی ہو، مجھے تم سے دیوانہ وار محبت ہے۔ میں تمہیں زندہ جلتا ہُوا نہیں دیکھ سکوں گا۔ اپنی جُون بدلو اور بھاگ جاؤ اور اگر تم ایسی نہیں ہو تو میں تمہیں پادریوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ وہ تمہارے گلے میں کڑا ڈال دیں گے اور تمہیں سونے نہیں دیں گے۔ اگر تم ڈائن ہو تو بھاگ جاؤ۔"

میریا نے اپنے آپ کو کالی بلّی میں نہ بدلا کیونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ رونے لگی اور رو رو کر خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔

"سُنو میری رفیقہ!" —— سپالنزا نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا —— "میرا باپ کہا کرتا تھا کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب لوگ جادوگرنیوں، چڑیلوں اور ڈائنوں کو ماننے والوں پر ہنسا کریں گے۔ میرا باپ خدا کو نہیں مانتا تھا لیکن ہمیشہ یہ بات کہا کرتا تھا۔ وہ وقت ضرور آئے گا جب لوگ ڈائن کے وجود کے مُنکر ہو جائیں گے۔ اس وقت تک کہیں چھپ جاؤ۔ چھپنے کی جگہ موجود ہے۔ میرے بھائی کرسٹوفر کا بحری جہاز بندرگاہ میں مرمت ہو رہا ہے۔ میں تمہیں وہاں چُھپا دوں گا اور اس وقت باہر نکالوں گا جب لوگ اس بے بنیاد عقیدے سے

منحرف ہوجائیں گے۔ میرے باپ کو یقین تھا کہ وہ وقت جلدی آئے گا۔"

اسی رات سپالنزا نے میریا کو جہاز کے سب سے نیچے والے حصّے کے ایک کیبن میں چھپا دیا جہاں وہ جہاز کے ساتھ ٹکراتی ہوئی سمندری لہروں کی کبھی نہ ختم ہونے والی آواز سُنتی رہی اور اُس وقت کا انتظار کرنے لگی جس کی پیشین گوئی سپالنزا کے باپ نے کی تھی۔

دوسرے دن بڑے پادری نے سپالنزا کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کالی بِلّی بن کر کہیں بھاگ گئی ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا" — بڑے پادری نے کہا — "ہم اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے ورنہ وہ نہ جانے کتنے مردوں کو دھوکہ دے کر انہیں ہلاک کر ڈالے گی اور نہ جانے کتنی تباہی کا باعث بنے گی۔ آگسٹن کی نگاہ بہت تیز ہے۔ اُس کی سراغرسانی غلط نہیں ہوسکتی۔ جاؤ، آئندہ کسی لڑکی کے حسن سے متاثر ہو کر اسے بیوی نہ بنا لینا۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس ڈائن سے بچ گئے ہو۔ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ ایسی جادوگرنیوں نے بیویوں کا روپ دھار کر خاوندوں کو بھی بدروح بنا ڈالا ہے۔ پچھلے سال میں نے ایسے ہی ایک زاہد کو جلایا تھا کیونکہ اس کی ڈائن بیوی نے اسے بدرُوح بنا دیا تھا۔"

بڑے پادری اور عدالتِ عالیہ کے چار ججوں نے اشتہار پر دستخط ثبت کر کے سارے شہر میں اعلان مشتہر کرا دیا کہ میریا نام کی جادوگرنی کو زندہ یا مُردہ پکڑنے والے یا اس کا اتا پتا بتانے والے کو اس کے تمام تر گناہوں کی معافی دلوا دی جائے گی۔ اُس دَور میں پادریوں نے لوگوں کو ذہن نشین کرا رکھا تھا کہ پادری خُدا کا سفیر اور ایلچی ہوتا ہے اور وہ اپنی سفارش سے کسی بھی گناہگار کے گناہ بخشوا سکتا ہے۔

مہینے گزرتے چلے گئے۔ میریا بحری جہاز کے تہ خانے میں بند لہروں کو جہاز سے ٹکراتا سُنتی رہی۔ سپالنزا ایک وفادار اور محبت خاوند کی طرح ہر رات اُس کے پاس چلا جاتا اور اس کی ہر ایک ضرورت دل و جان سے پوری کرتا۔ مگر انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ عقیدے اتنی جلدی بدلا نہیں کرتے۔ یہ تو

نسلوں تک چلتے ہیں اور بدلتے بدلتے کئی صدیاں لے لیتے ہیں۔ بہرحال ان کی محبت نے انہیں گمراہ نہ ہونے دیا۔ میریا قید و بند اور لہروں کے شور کی عادی ہوگئی۔ وہ پادریوں کا مذاق اڑایا کرتی۔ سپالنزا کے بھائی نے انہیں کہا تھا کہ جب جہاز مرمت ہو جائے گا تو وہ انہیں توہم پرست سپین سے دور دنیا کے کسی حسین خطے میں لے جائے گا مگر ایک روز میریا کی قسمت پر مہر ثبت ہوگئی۔

ہُوا یوں کہ سپالنزا نے بڑے پادری اور عدالتِ عالیہ کے ججوں کے اعلان کی طرف پوری توجہ نہیں دی تھی۔ ایک روز اس نے اعلان کا آخری فقرہ پڑھا — "تمام تر گناہوں کی معافی دلوا دی جائے گی" — یہ ایسا لالچ تھا جس نے سپالنزا کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اسے شادی سے پہلے کے گناہ یاد آنے لگے اور وہ جہنم کے عذاب سے ڈرنے لگا۔ وہ بھی اس عقیدے کو مانتا تھا کہ پادری گناہ بخشوا سکتے ہیں اور کسی بھی انسان کو خدا کا منظورِ نظر بنا سکتے ہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ تولیدو میں رہا کرتا تھا تو اس نے ایسے ایسے گناہ کئے تھے جن کی پاداش میں کئی لوگوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا یا اذیت دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔ ان میں جادوگری اور کیمیاگری جیسے جرائم بھی شامل تھے۔ اس نے باپ کی رہبری میں کئی ایک جانوروں کی انتڑیاں اور جسم کے اندر کے دیگر حصّے اور عجیب و غریب جڑی بُوٹیاں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک بار وہ باپ کے کہنے پر کچھ رگڑ رہا تھا کہ ایک دھماکہ ہُوا اور نیلا شعلہ اُٹھا تھا۔ تولیدو میں اس کی زندگی ایسے ہی گناہوں سے اٹی پڑی تھی اور اب وہ دُنیا اور آخرت کے عذاب سے ڈرنے لگا تھا۔ جب اس کا باپ مر گیا تو وہ تولیدو سے بارسیلونا منتقل ہو گیا تھا مگر وہ گناہ جو اس نے تولیدو میں کئے تھے اس کے ضمیر میں زہریلے کانٹوں کی طرح چُبھ رہے تھے۔

ایک بار ضمیر کی کربناک پکار سے پریشان ہو کر اس نے ایک پادری سے بات کی اور اسے اپنے گناہوں کی داستان سنا ڈالی تھی۔ پادری نے اُسے کہا تھا کہ وہ کوئی پاکیزہ کارنامہ کر دکھائے یا ننگے پاؤں یا پیادہ کسی مقدس اور متبرک جگہ تک جائے تو اس کے گناہ بخشے جائیں گے۔ سپالنزا اسی سوچ میں کھویا رہتا تھا کہ وہ

کون سا پاکیزہ کارنامہ سر انجام دے۔ اس کا کاروبار ایسا تھا کہ وہ پا پیادہ کسی دور دراز متبرک مقام تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک موقع آ گیا تھا اگر میریا اس کی اپنی بیوی تھی۔ بیوی بھی ایسی جس سے اسے پوجا کی حد تک محبت تھی۔ اس نے آہ بھر کر اپنے آپ سے کہا ——"کاش میریا میری بیوی نہ ہوتی تو میں اسے بڑے پادری کے حوالے کر کے سارے گناہ بخشوا لیتا"—— ایک طرف بے گناہ بیوی کی محبت تھی اور دوسری طرف پادریوں کا یہ فرمان کہ اس کے گناہ بخشوا دیں گے۔ سپالنزا اورمیان میں پسنے لگا۔ آخر ایک روز اس نے اپنے بھائی سے بات کی۔

"گناہوں کی بخشش عظیم نعمت ہے"—— اس کے بھائی نے اسے کہا ——"اگر میریا ڈائن ہوتی اور اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو میں اسے پادریوں کے حوالے کر دیتا مگر وہ خوبصورت بھی ہے اور ڈائن بھی نہیں اور ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ پادری کہتے ہیں کہ وہ جادوگرنی اور ڈائن ہے۔ پادریوں کے کہے ہوئے الفاظ کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا"—— بھائی نے سوچ سوچ کر کہا ——"میریا کی موت کا انتظار کرو۔ اس قید میں وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔ جب وہ مر جائے تو اس کی لاش پادریوں کے حوالے کر دینا۔ وہ اسے جلا دیں گے یا چیلوں اور گدھوں کے آگے پھینک دیں گے۔ مرے ہوئے انسان کو درد محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی موت کا انتظار کرو اور اس کی لاش پادریوں کے حوالے کر کے گناہ بخشوا لو۔"

"اور اگر میریا سے پہلے میں مر گیا تو؟"—— سپالنزا نے اپنے بھائی سے کہا ——"پھر میں خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔ میں اسے مرنے سے پہلے پادریوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں .... کاش وہ میری بیوی نہ ہوتی۔"

سپالنزا آٹھ دس دن پریشان رہا اور یہی کچھ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا ——"کاش! میریا میری بیوی نہ ہوتی تو میں اسے پادریوں کے حوالے کر دیتا .... خدا کرے وہ مجھ سے پہلے مر جائے"—— میریا کی موت ایک خواہش بن کر اس کے دل و دماغ پر قابض ہوتی چلی گئی۔ وہ میریا کو پادریوں کے حوالے زندہ حالت میں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے زندہ جلا دیں گے اور

اس کی جلی ہوئی لاش کو کتوں کے آگے پھینک دیں گے۔ مر جانے کی صورت میں اسے جلا دینا سپالنزا کو گوارا تھا۔

آخر ایک روز اسے پادریوں کے عقیدے اور اپنے ضمیر کی آواز نے اس قدر بے حال کر دیا کہ اس نے اپنی بیوی کو زہر دے دیا۔ وہ مر گئی تو اس نے اس کی لاش بڑے پادریوں اور ججوں کے حوالے کر دی۔ اُنہوں نے لاش کو جلا دیا اور اس کارنامے کے عوض بڑے پادری نے اسے مژدہ سنایا کہ اس کی سفارش پر خدا نے اس کے وہ تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں جو اس نے تولیدو میں کئے تھے۔ یہ لوگوں کو بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ تولیدو میں باپ کی رہنمائی میں جڑی بُوٹیوں کے جو تجربے کرتا رہا ہے اور جسے وہ جادوگری سمجھتا رہا ہے، وہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ انہی تجربوں سے آج کی دوائیوں یعنی کیمسٹری نے جنم لیا اور جادوگری جو تھی وہ ریاضی اور الجبرا تھا۔ اس وقت پادری ان علوم کو گناہ سمجھتے تھے۔

میریا کی لاش کو جلا کر بڑے پادری نے سپالنزا کو اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب انعام میں دی جس میں اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ شیطان سیاہ بالوں والی عورت کو پسند کرتا ہے اور سیاہ رنگ شیطان کا ہوتا ہے۔

* * *

یہ اُس دَور کی کہانی ہے جب شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ قبائلی پٹھان ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء تک پوری ایک صدی لڑے اور اُنھوں نے اپنے علاقے پر انگریز کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ قبائلی علاقہ ہمیشہ پُراسرار اور انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کیلئے خطرناک رہا ہے۔ بنّوں، کوہاٹ اور پشاور پر بھی پٹھان حملے کیا کرتے تھے۔ ان دلیرانہ اور مجاہدانہ واقعات سے کچھ ڈرامے بھی جنم لیتے تھے —— ”پانچویں لڑکی“ ایسا ہی ایک ڈرامہ ہے۔

پانچویں لڑکی

خُوش بابا سے کہانی سننا صبر اور حوصلے کا کام ہے۔ وہ باتیں کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔ اُن کے جاگنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور اُن کو یاد کرانا پڑتا ہے کہ وہ فلاں بات سنا رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ کو ایک رات ایک اور پرانا قصہ سنانا شروع کیا۔ انہیں سن اور تاریخیں بالکل یاد نہیں۔ اُنھوں نے سنایا۔

”ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ فرنگی کی فوج کا کوئی افسر یا سپاہی زندہ ہاتھ آجاتے۔ اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فرنگی ہمیں پیسے دیا کرتا تھا۔ قیدی کی قیمت پولیٹیکل ایجنٹ کی معرفت طے ہوتی تھی۔ اگر قیدی فرنگی ہو تو قیمت زیادہ ملتی تھی۔ ہندوستانی ہو تو فرنگی بہت تھوڑے پیسے

ون اردو ڈاٹ کام

دیتا تھا۔ دراصل فرنگی ہندوستانی سپاہی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اگر سپاہی مسلمان ہو تو اسے ہم چھوڑ دیتے تھے اور اگر ہندو یا سکھ ہو اور فرنگی ہمیں اس کی قیمت دینے سے انکار کر دے تو ہم اسے مار دیا کرتے تھے۔"

"بابا جان!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "آپ انہیں مسلمان کیوں نہیں کرتے تھے؟"

"نہ نہ نہ" ــــ بابا نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ــــ "کلمہ پڑھ کر کافر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ہندو کے جسم میں ہندو کا خون ہوتا ہے۔ یہ سانپ کا خون ہے۔ بدل نہیں سکتا۔ جس طرح سانپ ڈنک مارتا ہے اسی طرح ہندو بھی ڈنک مارتا ہے۔ ہم کسی کافر کو مسلمان نہیں بناتے تھے۔ فرنگی سے زیادہ ہمارے دل میں ہندو کی نفرت تھی ....

"فرنگی اپنے افسر کی لاش کی بھی قیمت دیتا تھا۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ لڑائی کے بعد فرنگی کی فوج لاشیں نہ اُٹھا سکے لیکن وہ تو بچانے کے اتنے زیادہ گولے فائر کرتے تھے کہ ہم آگے نہیں جا سکتے تھے اور فوج لاشیں اُٹھا کر لے جاتی تھی ... ہم شہروں پر حملے کر کے ہندوؤں کے گھر خالی کر جاتے تھے اور جو ہندو ساہوکار ہوتے تھے اُن کی لڑکیاں اُٹھا لاتے تھے۔ اگر کوئی لڑکی نہ ملے تو کسی ہندو سیٹھ یا ساہوکار کو اُٹھا لاتے تھے۔ ہم کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ہمارے قبضے میں جوان لڑکی ہے یا بوڑھا سیٹھ۔ ہم کو صرف یہ غرض ہوتی تھی کہ لڑکی ہے یا بوڑھا آدمی ہم کو اس کے پیسے مل جائیں اور ہم اس کو چھوڑ دیں۔ صرف اس واسطے ہم ان کو لاتے تھے۔ یہ بنّوں کا شہر جو تم کو آج نظر آتا ہے، میری جوانی میں ایسا نہیں تھا۔ بہت چھوٹا شہر تھا۔ اندر جو قلعہ ہے اس میں فوج ہوتی تھی۔ بازار میں ہندوؤں کی دکانیں زیادہ تھیں۔ سکھ بہت تھوڑے تھے۔ مسلمان بھی دکانداری اور مزدوری کرتے تھے۔ فرنگی ہندوؤں کی بہت حفاظت کرتا تھا۔ فوج کی ٹھیکیداری ہندو کرتے تھے۔ اس واسطے بہت امیر تھے ....

"شہر کے اِردگرد کانٹوں والے تاروں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ صرف

دو گیٹ تھے۔ دونوں شام کے بعد بند ہو جاتے تھے اور ان کے ساتھ پکے مورچوں میں گارد ہوتی تھی۔ تاروں کے ساتھ ساتھ ان کی طرف فوج کا گشتی پہرہ ہوتا تھا۔ باہر سے کوئی آدمی تاروں کے قریب جانے کی دلیری نہیں کرتا تھا فوجی گولی مار دیتے تھے۔ تار ایک ہی نہیں تھا دس گز چوڑائی میں تاروں کے گچھے ہوتے تھے۔ ان میں سے سانپ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ پھر بھی ہم لوگ کبھی کبھی رات کے وقت شہر میں داخل ہو جاتے تھے اور ہندوؤں کا صفایا کر جاتے تھے لیکن ہمارے بہت سے دوست مارے جاتے یا پکڑے جاتے تھے ....

"فرنگی اِدھر بہت فوج جمع کر کے ہمارا بہت نقصان کرتا تھا۔ وزیرستان کے علاقے میں ہماری نہ کوئی گائے بکری زندہ رہتی، نہ کوئی مکان کھڑا رہتا اور جہاں کہیں کسی نے تھوڑی سی زمین میں کوئی بیج بویا ہوتا وہ بھی فرنگی کی فوج تباہ کر جاتی۔ ہم ہمیشہ مقابلہ کرتے اور فوج کا نقصان کرتے تھے مگر ہماری فوج نہیں تھی۔ اُدھر فوج تھی۔ کئی بار ہمارے تھوڑے سے آدمی قید ہو گئے۔ فرنگی نے ہمارے بچّوں کو بھی قید کر لیا...

"ایک بار ایسے ہُوا کہ باہر سے آئی ہوئی فوجیں بنّوں سے واپس چلی گئیں۔ فرنگی خوش تھا کہ اُس نے ہم کو تباہ کر دیا ہے۔ اس واسطے اب ہم کچھ نہیں کریں گے۔ فرنگی نے پولیٹیکل ایجنٹ کے آدمیوں کو ہمارے پاس بھیجا اور ہم کو یہ شرط بتائی کہ ہمارے قیدی رہا ہو جائیں گے مگر تم بنّوں سے آگے کُرم گڑھی اور دوسری طرف چار میل دُور فوج کو چوکیاں بنانے دو اور اس علاقے میں پٹھان فرنگی کی فوج کو نہیں چھیڑے گا۔ ہمارے بزرگوں نے کہا کہ فرنگی ہمارے ملک پر آہستہ آہستہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو کہہ دو کہ ہم اپنے قیدی خود آ کر چھڑا لیں گے اور تمہاری بادشاہی بنّوں کے اندر رہے گی۔ تاروں کے باہر ہماری بادشاہی ہے --- پھر ہم کو یہ لالچ دیا کہ تم لوگ فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ راشن اور کپڑا ملے گا۔ تنخواہ ملے گی اور فرنگی تمہارے گھروں کو تباہ نہیں کرے گا۔ ہمارے بزرگوں نے ان آدمیوں کی بہت بے عزّتی کر کے واپس

بھیج دیا۔ یہ لوگ بھی پٹھان تھے مگر فرنگی کے لالچ میں آ گئے تھے اور اس کی نوکری کرتے تھے....

"ہمارے ملکوں اور سرداروں نے ادھر جمع ہو کر فرنگی سے بدلہ لینے اور اپنے قیدی چھڑانے کی سکیم بنائی۔ میں اس وقت جوان تھا۔ سکیم یہ تھی کہ بنوں شہر پر حملہ کر کے آگ لگانا، ہندوؤں کو لوٹنا اور جوان عورتوں کو اٹھا کر لے جانا اور اپنے قیدیوں کو رہا کرانا۔ حملہ رات کے وقت کرنا تھا مگر شہر میں داخل ہونا بہت مشکل تھا۔ شہر کے باہر سے تھوڑے سے آدمی ہر روز اندر جاتے تھے۔ وہ کسی ٹھیکیدار کے پاس یا کسی دفتر میں قلی چپڑاسی کی نوکری کرتے تھے۔ ان لوگوں کو پولیٹیکل ایجنٹ اور پولیس نے اس واسطے پاس دیئے تھے کہ یہ آدمی خطرناک نہیں ہیں۔ صبح کو جب وہ شہر میں جاتے تھے تو گیٹ پر ان کے پاس دیکھے جاتے تھے۔ شام کے بعد ان کو شہر میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ لوگ کسی مجبوری سے شہر میں نوکری کرتے تھے لیکن وہ پٹھان تھے۔ ان کا دل فرنگی کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ ہم کو اندر کی خبر باہر آ کر دیتے تھے۔ ایسا سمجھو کہ وہ ہمارے جاسوس تھے...

"ہم نے ان میں سے دس آدمی تیار کر لیے کہ وہ شام کے بعد شہر سے باہر نہیں آئیں گے۔ اندر کہیں چھپ جائیں گے اور رات کے وقت وہ ہم کو اندر جانے کا راستہ دیں گے۔ وہ گیٹ نہیں کھول سکتے تھے نہ گیٹ کے قریب جا سکتے تھے۔ جاتے تو پکڑے جاتے کہ تم رات کو کس واسطے اندر رہ گئے۔ ہم نے ان کو سمجھا دیا کہ وہ کیا کریں گے۔ وہ اندر رائفل نہیں لے جا سکتے تھے۔ سب بندوبست تیار ہو گیا اور رات کا وقت مقرر ہو گیا۔ تاروں کے اندر جو فوجی گشت کرتے تھے وہ اس طرح کرتے تھے کہ دو آگے اور بیس پچیس قدم دو پیچھے۔ اسی طرح دوسری طرف دو آگے اور دو پیچھے....

"جس رات حملہ کرنا تھا، یہ دس آدمی صبح کے وقت شہر کے اندر گئے جس طرح روزانہ جاتے تھے۔ ان کے پاس رائفل نہیں تھی۔ شلوار کے اندر ٹانگ کے ساتھ ہر ایک نے ایک ایک خنجر باندھا ہوا تھا۔ شہر کے اندر

انہوں نے تین چار آدمیوں کے گھروں میں دوستی بنائی ہوئی تھی۔ انہوں نے وہاں بتایا کہ رات کو کیا ہو گا۔ وہ لوگ خوش ہو گئے کہ ہندوؤں کو لوٹیں گے۔ انہوں نے ان دس آدمیوں کو گھروں میں چھپا لیا اور تار کاٹنے کا سامان بھی دے دیا۔ ادھر شام کے بعد ہمارے لوگ ایک جگہ جمع ہونے لگے اور دو سو سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے۔ ہم نے سب کو بتایا کہ کدھر سے اندر جانے کا راستہ ملے گا۔ وقت سے پہلے سب لوگ بہت خاموشی سے باہر پہنچ گئے۔ کوئی آدمی آواز نہیں نکالتا تھا....

"آدھی رات سے تھوڑا پہلے اندر کے دس آدمی خنجر لے کر ان گھروں سے نکلے جہاں وہ چھپے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ تاروں کے ساتھ فوجی کس طرح گشت کرتے ہیں۔ وہ چھپ گئے۔ دو فوجی ان کے پاس سے گزر گئے۔ وہ تاروں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بیس پچیس قدم آگے چلے گئے تو دوسرے دو فوجی آئے۔ وہ تھوڑا آگے گئے تو ہمارے دو آدمیوں نے پیچھے سے بازو ان کی گردنوں پر لپیٹ کر دبا لیا۔ ان کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ فوراً ہی خنجر ان کی پسلیوں میں اتر گئے۔ آگے والوں کو پیچھے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہمارے دو آدمی آگے بھی تھے۔ انہوں نے ان کا وہی حال کر دیا جو پیچھے والوں کا ہوا تھا۔ پھر دس کے دس آدمی تار کاٹنے لگے۔ خطرہ یہ تھا کہ چار اور فوجی اسی چکر میں آ رہے تھے۔ ہمارے بہت سے آدمی جو باہر تھے تاروں کے قریب چلے گئے تھے۔ ان کو اشارہ ملا تو وہ باہر سے تار کاٹنے لگے۔ جلدی جلدی سے ایک جگہ سے راستہ صاف ہو گیا اور دو سو پٹھان اس جگہ سے اندر چلے گئے۔ تم ایسا سمجھو جیسا ایک جگہ سے دریا کا کنارا تھوڑا سا کاٹو تو اس جگہ سے پانی زور دے کر باہر آتا ہے....

"اگر اس وقت کا کوئی آدمی بنوں شہر میں آج زندہ ہے تو اس سے پوچھو کہ اس رات بنوں میں کیا ہوا تھا۔ شہر میں اتنی گولیاں چلتی تھیں جس طرح چھت پر بارش پڑتی ہے۔ آسمان پھٹ رہا تھا۔ ہندوؤں نے دروازے اندر سے بند کیے ہوئے تھے۔ ہم کو جس گھر پر شک ہوتا تھا کہ اندر روپیہ

پیسہ اور سونا ہے ہم اس کے دروازے توڑ کر اندر چلے جاتے تھے۔ ہوا میں اور دائیں بائیں گولیاں چلاتے تھے اور کوئی ہم کو روکتا تھا اس کو گولی مار دیتے تھے۔ فوراً فوج آگئی۔ ہم نے مکانوں کو آگ لگانی شروع کر دی۔ بہت سے آدمی دکانیں لوٹ رہے تھے۔ اب ہم لوگ فوج کا مقابلہ بھی کرتے تھے اور لوٹتے بھی تھے۔ بہت گولیاں چلتی تھیں۔ اتنی زیادہ گولیاں کہ تم سوچ نہیں سکتے۔ آگ اتنی لگی تھی کہ شہر میں دن کی طرح روشنی ہو گئی تھی۔ اس روشنی میں فوج کے سپاہی اور پٹھان الگ الگ پہچانے جاتے تھے....

”اس کو ہندوستان کے لوگ اور فرنگی ڈاکہ کہتے تھے، لیکن ہم اس کو حملہ کہتے تھے۔ اس کی اتنی دہشت ہوتی تھی کہ کوئی آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ سب چھپنے کی کوشش کرتے تھے۔ فوج آگئی تو سپاہی بھی چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے سارے شہر کو آگ لگی ہوئی ہے۔ پٹھان سامان اٹھا کر ایک ایک کر کے یا تین تین، چار چار کی ٹولیوں میں شہر سے نکل رہے تھے....

”دوسرے دن ہم کو معلوم نہیں تھا کہ بنوں شہر کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ہم کو اپنا حال معلوم تھا۔ ہم نے بہت مال اسباب اٹھایا تھا اور پانچ ہندو لڑکیاں اور ایک ہندو ٹھیکیدار کو بھی ہمارے آدمی ساتھ لے آئے تھے۔ ہمارے سرداروں نے پولیٹیکل ایجنٹ کے آدمیوں کو پیغام دیا کہ ٹھیکیدار کا دو ہزار روپیہ اور ہر ایک لڑکی کا ایک ایک ہزار روپیہ دو اور ان کو لے جاؤ۔ ہمارے جو آدمی شہر میں نوکری کرنے جاتے تھے ان کو بھی ہم نے لڑکیوں اور ٹھیکیداروں کے گھروں کے پتے دیئے اور ان کے رشتہ داروں کو یہ قیمت بتائی مگر ہمارے سرداروں نے یہ شرط بھی پیش کر دی کہ اس رقم کے ساتھ ہمارے قیدی بھی رہا کراؤ تو تم کو تمہاری لڑکیاں اور ٹھیکیدار واپس مل جائے گا۔ میں نے تم کو بتایا ہے کہ فرنگی نے ہمارے بچوں کو بھی قید میں رکھ لیا تھا۔ ہم نے ڈاکے والی رات اپنے قیدیوں کو چھڑانے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ قلعے میں بند تھے۔ قلعے میں ہم داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس واسطے ہمارے بزرگوں نے ہندوؤں کو پیغام دیا کہ

فرنگی کو کہو کہ ہمارے قیدی چھوڑ دے اور ہم کو رقم بھی دو پھر اپنی لڑکیاں لے جاؤ....

”ہندوؤں کے واسطے یہ بہت مشکل کام تھا کہ وہ فرنگی کو ہمارے قیدی چھوڑنے پر مجبور کریں اور یہ بھی ان کے لیے مصیبت تھی کہ ہم نے رقم زیادہ مانگی تھی۔ آج تمہارے لیے ایک ہزار اور دو ہزار روپیہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ رقم دس ہزار اور بیس ہزار کے برابر ہوتی تھی۔ انہوں نے دس دن بعد جواب دیا کہ رقم لے لو لیکن فرنگی تمہارے قیدی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ ہم کو معلوم تھا کہ فرنگی اور ہندو کی بہت دوستی ہے۔ اس واسطے ہم نے جواب دیا کہ ہمارے قیدی چھڑاؤ ورنہ ہم تمہاری لڑکیاں اور ٹھیکیدار نہیں چھوڑیں گے .... ہمارے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ اگر ہمارے قیدی نہیں آئیں گے تو ہم ہندو قیدیوں کی رقم دگنی کر دیں گے....

”اس سودے میں تین مہینے گزر گئے۔ ان تین مہینوں میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جو ادھر کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ ہمارا ایمان تھا کہ قیدی عورت کو ہم لوگ امانت سمجھتے تھے اور اس کو اپنی عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ کسی مرد کی نیت خراب نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی پٹھان جوان کسی ہندو یا سکھ لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرتا تھا۔ اس واسطے کہ پٹھان کی نسل خراب ہوتی تھی اور ایمان بھی برباد ہوتا تھا۔ ہم ان کو کوئی تکلیف بھی نہیں دیتے تھے اور جو مرد قیدی ہوتے تھے ان کو بھی کوئی تکلیف نہیں دیتے تھے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ اس کا پیسہ نہیں ملے گا تو اس کو مار دیتے تھے۔ یہ جو پانچ لڑکیاں تھیں ان کو ہم نے پہاڑوں کے اندر بھیج دیا۔ ہم قیدیوں کو کسی گاؤں میں اس واسطے نہیں رکھتے تھے کہ جب فوج کا حملہ آتا تھا تو ہم کو گاؤں چھوڑنا پڑتا تھا۔ تم کبھی پہاڑوں کے اندر گئے ہو تو تم کو نظر آیا ہو گا کہ کہیں کہیں ایک کچا مکان ہے اور اس سے تھوڑا دور ایک اور کچا مکان ہے۔ اُس زمانے میں پٹھان اسی طرح

رہتے تھے ....

” اُدھر دو تین مکان قریب قریب تھے۔ لڑکیاں ان کے حوالے کر دیں۔ وہ لڑکیوں کو کسی گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ ایک غار تھا۔ اس میں ان کو چھپا دیتے تھے اور رات کے وقت دو آدمی غار کے باہر سوتے تھے۔ پہاڑوں کے اندر کوئی آدمی قید ہو جائے تو وہ بھاگنے کی دلیری نہیں کرتا تھا۔ لڑکی کا تو ہم کو ڈر نہیں تھا کہ بھاگ جائے گی.... پانچوں لڑکیاں خوبصورت اور جوان تھیں لیکن ایک بہت خوبصورت تھی۔ باقی سب روتی تھیں۔ یہ جو پانچویں تھی وہ بالکل نہیں روتی تھی۔ وہ تیز لڑکی تھی۔ چار لڑکیاں ہمارے جوانوں کو دیکھ کر ڈرتی تھیں۔ پانچویں لڑکی نہیں ڈرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہندو کی لڑکی نہیں کسی پٹھان کی لڑکی ہے۔ چار لڑکیاں پنجابی بولتی تھیں۔ پانچویں لڑکی پشتو بولتی تھی۔ اس کی مادری زبان بنوں والی پنجابی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ بنوں شہر میں جو پٹھان رہتے ہیں ان کی لڑکیوں کے ساتھ وہ اٹھتی بیٹھتی ہے اور اس کی کوئی سہیلی ہندو نہیں ہے۔ سب مسلمان ہیں۔ وہ بچپن سے پٹھان لڑکیوں کو پسند کرتی تھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہُوا کہ دوسری لڑکیوں کو جب اٹھایا گیا تھا تو وہ بہت روتی تھیں لیکن اس لڑکی نے دو پٹھانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ایک ڈنڈا تھا جس سے اُس نے ایک پٹھان کے تین دانت توڑ دیئے۔ لڑکی کو مارنا نہیں تھا۔ اُٹھانا تھا۔ دوسرے پٹھان نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو لڑکی نے اسے بھی ڈنڈا مارا۔ پٹھان نے رائفل پر ڈنڈا روک لیا....

” لڑکی کی دلیری دیکھو کہ گھر میں چار آدمی تھے۔ وہ بالکل نہیں لڑے۔ وہ دونوں پٹھانوں کے آگے ہاتھ جوڑتے تھے اور منّت کرتے تھے کہ گھر میں جتنا پیسہ ہے لے جاؤ۔ تم چلے جاؤ لیکن لڑکی اپنے باپ کو اور اپنے بھائیوں کو گالیاں دیتی تھی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اُن بے غیرتوں نے اپنی لڑکی کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔ جس پٹھان کے لڑکی نے دانت توڑ دیئے تھے اُس نے خنجر نکال لیا اور لڑکی کو قتل کرنے کے لیے دوڑا۔ دوسرے پٹھان نے اس کو روک دیا اور کہا کہ شرم کرو۔ تم عورت ذات کے ساتھ لڑائی کرتے ہو.... اللہ دونوں کو جنّت میں جگہ دے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک دوسرے کے ہاتھوں مر گئے تھے۔ جس کے دانت ٹوٹے تھے اس کا نام بخت گُل اور دوسرے کا نام طوطی خان تھا۔ بخت گُل بہت غصّے میں تھا۔ اس کے دانت ایک لڑکی نے توڑ دیئے تھے۔ طوطی خان نے اسے روکا تو وہ اس پر بھی غصّہ کرنے لگا۔ طوطی خان نے اس کو کہا کہ تم لڑکی پر خنجر چلاؤ گے تو میں تم پر گولی چلاؤں گا... لڑکی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر کھڑی تھی۔ اس نے پشتو میں ان کو للکار کر کہا کہ تم میری لاش لے کر جاؤ گے۔ مجھ کو لڑکی مت سمجھو، مقابلہ کرو....

” طوطی خان اور بخت گُل آپس میں لڑنے پر تیار ہو گئے۔ میرے ساتھ میرے گاؤں کے دو آدمی تھے۔ ہم تینوں ایک طرف سے دیوار کے اُوپر سے اندر چلے گئے۔ اندر یہ تماشا دیکھا کہ طوطی خان اور بخت گُل آپس میں تُو تُو مَیں مَیں کر رہے تھے۔ بخت گُل کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ لڑکی ایک طرف کھڑی تھی اور چار ہندو ہاتھ جوڑ کر الگ کھڑے تھے۔ وہ ہم کو دیکھ کر گھر سے بھاگ گئے۔ ہم نے ان کو نہیں روکا۔ لڑکی اور اس کی ماں رہ گئیں۔ طوطی خان نے ہم کو بتایا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ہم نے دونوں کو گالیاں دیں اور کہا کہ تم دشمن کے گھر میں آ کر آپس میں لڑتے ہو۔ ہم نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ اُس نے بہت زور لگایا لیکن اتنے آدمیوں کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی.... دوسرے دن ہم نے لڑکی اپنے قبیلے کے حوالے کر دی۔ یہ ہمارا دستور تھا کہ کوئی پٹھان کسی عورت کو اغوا کر کے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ قبیلے کا مالِ غنیمت ہوتا تھا۔ قبیلے کے بزرگ عورت کے مالکوں سے اس کی قیمت لیتے تھے پھر یہ رقم سب میں تقسیم ہوتی تھی....

” اس طرح پانچ لڑکیاں ہمارے قبضے میں آ گئیں۔ بخت گُل کے تین دانت ٹوٹ گئے تھے۔ منہ سُوج گیا تھا۔ وہ بڑا ظالم پٹھان تھا۔ اس کے لیے یہ شرم کی بات تھی کہ اس کے دانت ایک لڑکی نے توڑے ہیں۔ وہ کہتا تھا

کہ لڑکی میرے حوالے کر دو۔ اس کی ساری قیمت مجھے دو۔ بزرگوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس کو بتایا کہ یہ مالِ غنیمت ایک آدمی کا نہیں ہو سکتا۔ اس نے سب کے ساتھ بہت غصہ کیا اور یہی کہتا رہا کہ لڑکی نے مجھ کو زخمی کیا ہے اس واسطے لڑکی میرے حوالے کر دو۔ اس نے طوطی خان کو کہا کہ تم نے میرے ہاتھ سے لڑکی کو بچایا ہے، مَیں تم سے بھی بدلہ لُوں گا....

طوطی خان اور بخت گلؔ پہاڑوں کے اندر رہتے تھے۔ بزرگوں نے دونوں کو سمجھایا کہ ایک ہندو لڑکی کے پیچھے ایک دوسرے کا خون نہ کرنا۔ طوطی خان تو ٹھنڈا تھا لیکن بخت گُل بہت غصے میں تھا....

"لڑکیوں کو وہاں بھیج دیا گیا جہاں تم کو بتایا ہے۔ طوطی خان اور بخت گُل اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ ہندو ٹھیکیدار کو ایک اور جگہ بھیج دیا۔ قیدیوں کا سودا پولیٹیکل ایجنٹ اور قیدیوں کے رشتہ داروں کے ساتھ طے ہونے لگا۔ آدمی آتے جاتے تھے اور اس طرح دن گزر رہے تھے۔"

خوش بابا نے اس کے بعد اتنی لمبی کہانی سنائی جو پانچ گھنٹوں بعد ختم ہوئی۔ کوئی بات اسے کسی سے معلوم ہوئی اور کوئی بات کسی سے۔ اُس نے تفصیل سے سنایا کہ یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی اور کس طرح معلوم ہوئی۔ اگر میں اس طرح لکھوں تو آپ کا سارا پرچہ اسی ایک کہانی میں ختم ہو جائے گا۔ میں صرف واقعہ سیدھا اور مختصر کر کے اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔

طوطی خان اور بخت گُل جہاں کہیں رہتے تھے وہاں چلے گئے۔ لڑکیاں رات کو غار میں رکھی جاتی تھیں۔ دن کے وقت وہ پٹھان عورتوں کے ساتھ باہر پھرتی تھیں۔ پانی دُور تھا۔ وہ ہماری عورتوں کے ساتھ پانی کے گھڑے بھر لاتی تھیں۔ ان میں جو لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور جسے خوش بابا پانچویں لڑکی کہتا تھا، اس کا نام دیپ کماری تھا اور وہ اپنے آپ کو دیپ کہلاتی تھی۔ وہ پٹھان عورتوں کے ساتھ فرنٹیئر کی پتھریلی جگہ پر انہی کی طرح چلتی پھرتی اور خوش رہتی تھی۔ باقی چار لڑکیاں ہر وقت افسردہ رہتی تھیں اور پتھروں پر چلنے سے وہ بہت تکلیف محسوس کرتی تھیں۔ ان کو سب تسلیاں دیتے تھے کہ اِدھر کوئی آدمی تمہیں بے عزت نہیں کرے گا۔ جب تمہارے ماں باپ تمہاری قیمت دے دیں گے تو تمہیں واپس بھیج دیا جائے گا لیکن وہ پٹھانوں سے بہت ڈرتی تھیں۔

دیپ کو تو جیسے کوئی غم ہی نہیں تھا۔ وہ پشتو بولتی تھی۔ اس واسطے پٹھان عورتیں اس کو بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ اتنی زیادہ شوخ ہو گئی کہ مردوں کے ساتھ بھی نڈر ہو کر باتیں کرنے لگی۔ مرد بھی اسے پسند کرنے لگے۔ اس کے اس سلوک کی وجہ سے اس پر اعتبار کر لیا اور اس کو رات کے وقت غار سے باہر سونے کی اجازت دے دی۔ وہ دو رات باہر سوئی۔ تیسری رات وہ غائب ہو گئی۔ صبح کے وقت سب نے دیکھا کہ دیپ لاپتہ ہے۔ ہر طرف آدمی دوڑائے گئے۔ بنوں کے دروازے تک آدمی ہو آئے۔ لڑکی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ شام کے وقت لڑکی ایک پٹھان کے کندھے پر سوار واپس آ گئی۔ اس کی حالت بہت بُری تھی۔ اس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اس کی جوتی پھٹ گئی تھی اور پاؤں پتھروں پر چلنے سے زخمی ہو گئے تھے جو آدمی اسے اُٹھا کر لایا تھا اُس نے بتایا کہ وہ ایک جگہ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے پُوری طرح ہوش نہیں تھی اور بول نہیں سکتی تھی۔

لڑکی نے بتایا کہ رات کو کسی نے اسے جگا دیا۔ اس کی آنکھ کھُلی۔ ایک آدمی نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبائی اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا پھر اسے اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ بہت طاقتور تھا اس واسطے وہ اس سے آزاد نہیں ہو سکی۔ اُس نے منہ اور سر پر پگڑی لپیٹی ہوئی تھی اور رات کا اندھیرا بھی تھا۔ اس واسطے وہ اس کو پہچان نہیں سکی۔ بہت دُور جا کر پیچھے سے کسی آدمی نے اسے آواز دی۔ وہ لڑکی کو اُٹھائے ہوئے دوڑ پڑا۔ پیچھے سے آواز آئی ”رُک جاؤ نہیں تو گولی چلا دُوں گا“۔ اُس نے لڑکی کو کندھے سے اُتارا اور ایک چٹان کے پیچھے چھُپ گیا۔ اُدھر سے کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی آدمی دوڑتا آ رہا تھا۔ لڑکی کو اُٹھانے والا اُٹھ کر تھوڑا دُور چلا گیا۔ لڑکی نے اپنے منہ سے

کپڑا نکال دیا اور چٹان کے اُوپر جا کر ایک پتھر کے پیچھے چھُپ گئی۔

پیچھے سے آنے والا آدمی اس کے قریب سے گزر گیا اور جو اس کو اُٹھا لایا تھا وہ دُور نکل گیا۔ جب دونوں کے قدموں کی آواز بہت دُور چلی گئی تو وہ واپس چل پڑی لیکن پہاڑیوں میں راستہ بھول گئی۔ پہاڑیوں میں کوئی راستہ تو ہوتا ہی نہیں۔ وہاں صرف وہاں کے رہنے والے راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ لڑکی ساری رات بھٹکتی رہی۔ صبح ہوئی تو بھی وہ چل رہی تھی۔ اِس کے اِرد گرد اُونچے اُونچے پہاڑ تھے۔ خوف، پیاس اور تھکان نے اس کے جسم سے جان نکال دی۔ پھر وہ گر پڑی۔ سارا دن گزر گیا اور یہ آدمی آگیا۔ لڑکی نے اس کو سارا ماجرا بتایا تو اس نے لڑکی کو کندھے پر اُٹھا لیا اور واپس لے آیا۔

سب یہ سراغ لگانے لگے کہ لڑکی کو کون اُٹھا کر لے گیا تھا اور اس کا پیچھا کرنے والا کون تھا۔ پہاڑی علاقے میں کوئی آبادیاں نہیں ہوتی تھیں۔ وہاں کسی مجرم کا سراغ لگانا بہت ہی مشکل تھا۔ اتفاق سے کوئی بات معلوم ہو جاتی تھی ورنہ سارے راز پہاڑوں میں گُم ہو جاتے تھے۔ آج کل بھی پاکستان اور افغانستان کے قاتل اور ڈاکو فرنٹیئر کے قبائلی علاقے میں آ جاتے ہیں پھر یہاں سے انہیں کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا۔ جن پٹھانوں کی ذمہ داری میں یہ غار تھا انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ یہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور اس کی عادتیں ایسی ہیں کہ آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس واسطے اس کو زیادہ باہر نہ جانے دیا جائے اور رات کو غار کے اندر یا مکان کے اندر سُلایا جائے۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ لڑکی کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ غار میں سُلایا جائے اور دو آدمی غار کے باہر سوئیں۔

تین چار راتیں دیپ غار میں سوتی رہی۔ ایک رات وہ پھر غائب ہو گئی۔ پہرہ داروں کی بھی آنکھ نہ کھُلی۔ اس کی تلاش پہلے کی طرح شروع ہو گئی۔ اس دفعہ بتوں کی طرف کوئی نہیں گیا۔ سب پہاڑیوں میں پھیل گئے۔ دن گزر گیا۔ پھر رات بھی گزر گئی۔ لڑکی کا کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ اگلے دن ایک آدمی کو بخت گُل کی لاش نظر آئی۔ اُس کا پیٹ چیرا ہُوا تھا اور اس کا خنجر

اور اس کی رائفل اِس کے پاس پڑی تھی۔ وہاں سے بہت سارا خون ایک طرف کو جاتا نظر آیا۔ وہ آدمی خون کو دیکھ دیکھ کر چلتا گیا تو کچھ دُور اسے طوطی خان کی لاش نظر آئی۔ اس کے سینے پر اور گردن پر خنجر کے گہرے زخم تھے۔ وہاں سے بھی خون کے دھبے ایک طرف کو جاتے دکھائی دیئے۔ بہت خون تھا۔ بعض چھوٹے پتھر خون سے رنگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی خون کو دیکھتا دیکھتا تھوڑی دُور چلا گیا۔ ایک جگہ خون زیادہ تھا۔ وہاں سے پھر دھبے نظر آنے لگے۔ یہ تھوڑے تھے اور تھوڑا دُور دُور تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ آدمی چلتا گیا تو اس کو ایک جگہ دیپ نظر آئی۔ اس کی شلوار خون سے لال تھی۔ وہ زندہ تھی اور بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی ران پر خنجر کا زخم تھا اور ایک خنجر اس کے پاس پڑا تھا۔

اس آدمی کو معلوم تھا کہ یہ لڑکی قیدی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ اس نے اس کو اُٹھا لیا اور غار کی جگہ لے گیا۔ پٹھانوں نے اس کے زخم پر اپنا بنا ہُوا مرہم اور سفوف بھر دیا۔ اسے ہوش آیا تو اسے بکریوں کا دُودھ پلایا اور اس کو گائے کا گھی کھلانا شروع کر دیا۔ لڑکی بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں آئی تو اُس نے سنا کہ بخت گُل اور طوطی خان کس طرح مرے ہیں۔

لڑکی رات کو غار میں سوئی ہوئی تھی۔ غار بہت کھُلا تھا۔ باقی چار لڑکیاں ذرا دُور دُور سوئی تھیں۔ لڑکی کی آنکھ کھُل گئی۔ اسے کسی نے جکڑا ہُوا تھا اور اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونسا ہُوا تھا۔ وہ آدمی بہت طاقتور تھا۔ اُس نے اسے اُٹھا لیا۔ غار کے باہر دو آدمی سوتے ہوئے تھے۔ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ وہ اسے بہت دُور تک کندھے پر اُٹھا کر لے گیا۔ پھر ایک جگہ اسے اُتار کر اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ اس نے لڑکی سے کہا ”مَیں وہ آدمی ہوں جس کے منہ پر ڈنڈا مار کر تم نے دانت توڑ دیئے تھے“۔ دیپ نے اسے طعنے کے لہجے میں کہا ”تم پٹھان ہو؟ تم ہندوؤں کو گیدڑ کہنے والے پٹھان ہو؟ مجھ سے بدلہ لینے آئے ہو؟ میں عورت ہوں اور میں خالی

Scanned by qbalmt

ہاتھ ہوں۔ تمہارے پاس رائفل ہے اور خنجر بھی ہے۔۔۔۔ تم مجھ کو ضرور قتل کر دو گے لیکن جب تک زندہ ہوں تم میرے جسم کو ناپاک نہیں کر سکو گے۔"

"میں تم سے بدلہ نہیں لینا چاہتا"۔ بخت گُل نے اسے کہا — "میں تمہارے جسم کو بھی ناپاک نہیں کروں گا۔ اِدھر بیٹھ جاؤ اور میری بات سُن لو میں تم کو اس واسطے ادھر لایا ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کر لو۔ میں ادھر نہیں رہوں گا۔ تم کو ساتھ لے کر افغانستان چلا جاؤں گا۔ ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔"

لڑکی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ تم مجھے قیدی سمجھ کر اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو۔ تم لوگوں کو میرا ایک ہزار روپیہ مِل جائے گا۔ میں اپنے آپ کو تمہارے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔ بخت گُل نے کہا — "تمہاری جان میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تم کو ابھی ختم کر سکتا ہوں لیکن تم پر میرا ہاتھ کبھی نہیں اُٹھے گا۔ میں نے اتنی خوبصورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر میں تمہارا غلام اس واسطے بن گیا ہوں کہ تم جتنی خوبصورت ہو اتنی ہی دلیر اور بہادر ہو۔ تم ہندو کی بچی نہیں پٹھان کی بچی ہو۔ میں تم کو شہزادی بنا کر رکھوں گا۔"

دیپ نے اُس سے پوچھا کہ ان خشک پہاڑوں میں وہ اسے شہزادی کیسے بنائے گا؟ بخت گُل نے جواب دیا — "ڈاکے ڈالوں گا۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ افغانستان کے ڈاکو وہاں کے بادشاہ سے زیادہ امیر ہیں۔ فوج بھی ان سے ڈرتی ہے۔ میں تمہارے پاؤں میں سونے اور دولت کے ڈھیر لگا دوں گا۔"

دیپ انکار کرتی رہی۔ بخت گُل کے دل میں واقعی اس کی محبت تھی ورنہ جس پٹھان کا کام مرنا اور مارنا تھا وہ اس طرح منّت سماجت نہ کرتا۔ اس نے کہا — "دیکھو لڑکی! دنیا میں صرف دو عورتیں ہیں جن کے ایک اشارے پر میں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔ ایک میری ماں ہے اور دوسری تم ہو۔ میں تم سے بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن میرے دل میں جو غصّہ تھا وہ محبّت بن گیا اور میں تم کو جا کر اُٹھا لایا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ کوئی جاگ اُٹھتا تو وہ مجھ کو گولی مار دیتا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا دشمن میرا پیچھا کر رہا ہے۔

وہ طوطلی خان تھا جس نے تمہارے گھر میں تم کو مجھ سے بچایا تھا۔ اُس رات میں تم کو اُٹھا لایا تو وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ اسی لیے میں تم کو ایک جگہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"وہ تمہارا کیوں پیچھا کر رہا تھا؟" — دیپ نے پُوچھا۔

"اس واسطے کہ میں نے اس کو کہا تھا کہ اس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے میرے دانت توڑے ہیں" — بخت گُل نے کہا — "اور اُس نے کہا تھا کہ بخت گُلا، تم اس لڑکی کو ہاتھ لگاؤ تو پھر دیکھو تم زندہ کس طرح رہتے ہو۔"

"تم اُس سے ڈر کر بھاگ کیوں گئے تھے؟" — دیپ نے پوچھا۔

"میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا"۔ بخت گُل نے کہا — "اگر میں خون کرنا چاہتا تو تمہیں فوراً مار دیتا۔۔۔ آج تم کو پھر اُٹھا لایا ہوں۔ تم دیکھو کہ غار کے باہر اور اندر کتنا خطرہ تھا۔ وہ آدمی جو باہر سوئے ہوئے تھے جاگ پڑتے تو مجھے مار دیتے لیکن میں نے تمہارے واسطے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا۔ تم میری بات مان جاؤ۔ میں تم کو اتنی قیمت دوں گا کہ ساری دنیا کو بھُول جاؤ گی۔"

دیپ سوچنے لگی کہ اس آدمی سے وہ کس طرح آزادی حاصل کرے۔ وہ اس کے ساتھ لڑ نہیں سکتی تھی۔ بخت گُل کا یہ حال تھا کہ اُس نے اس ہندو لڑکی کے پاؤں پکڑ لیے اور محبت کی بھیک مانگنے لگا۔ وہ وقت رات کے آخری پہر کا تھا۔ لڑکی پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ اس کے دل پر یہ خوف نہیں تھا کہ بخت گل اسے جان سے مار دے گا یا اُس کی عزت پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کو دھوکہ دے کر بھاگنا چاہتی تھی۔ اس کو نیند آنے لگی تو اس نے کہا — "ادھر ہی سو جاؤ۔ صبح جاگیں گے تو میں تم کو جواب دُوں گی" — بخت گُل نے کہا — "تم سو جاؤ۔ میں جاگتا رہوں گا۔ میرا دشمن ضرور میرے پیچھے آئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں سویا رہوں اور وہ تم کو اُٹھا کر لے جائے۔ تم سو جاؤ۔"

دیپ وہیں لیٹ گئی اور بے غم ہو کر سو گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھُل

گئی۔ سورج نکلا ہوا تھا۔ آگے پیچھے اور اِدھر اُدھر اونچی چٹانیں تھیں اور ان کے پیچھے بہت اونچی پہاڑیاں تھیں۔ وہ اچھی جگہ چھپے ہوئے تھے — بخت گُل نے دیپ کو دیکھا کہ وہ جاگ اُٹھی ہے تو وہ اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بخت گُل اُٹھا۔ فوراً ہی ایک پٹھان چٹان کی اوٹ سے سامنے آگیا۔ وہ طوطی خان تھا۔ اُس نے بخت گُل سے کہا — ”میں ساری رات تمہیں ڈھونڈتا پھرتا رہا ہوں۔ تم گھر سے غائب تھے۔ مجھ کو معلوم تھا تم کہاں گئے ہو۔ تم لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔“

بخت گُل نے اس کو غصے میں جواب نہ دیا۔ اُس نے دوستوں کی طرح کہا — ”طوطی خاناں! اس سے پوچھو۔ یہ رات سے میرے پاس ہے۔ مَیں نے اس کو کیا کہا ہے۔ بدلہ نہیں لیا۔ بدلہ نہیں لوں گا۔ مَیں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ طوطی خاناں! مَیں اس کی مرضی کے بغیر اسے کہیں نہیں لے جاؤں گا۔“

طوطی خان اور بخت گُل میں تھوڑی دیر بحث ہوتی رہی۔

طوطی خان چُپ ہو گیا۔ بخت گُل طوطی خان کو بار بار یہی کہتا تھا کہ اسے یہ لڑکی اتنی اچھی لگتی ہے کہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے مگر یہ نہیں مانتی۔ طوطی خان بھی جوان آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ اگر اسے تم لے جاؤ گے تو مَیں کیوں نہ لے جاؤں؟ یہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ اس نے لڑکی سے پوچھا — ”تم دونوں میں سے کس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“

ہندو لڑکی کا دماغ بہت تیز تھا۔ اس کو موقع مِل گیا۔ اُس نے جواب دیا — ”یہ فیصلہ تم آپس میں کر دو“ — دونوں پھر بحث کرنے لگے۔ لڑکی نے جو ترکیب سوچی تھی وہ اُس نے کہہ دی۔ وہ یہ تھی — ”جس طرح میں ایک دلیر لڑکی ہوں، مجھ کو اسی طرح کا دلیر آدمی پسند ہے۔ تم دونوں کے پاس خنجر ہیں۔ میرا فیصلہ تمہارے خنجر کریں گے۔“

پٹھان بہادر تو ہوتے ہیں لیکن ان کی بہادری کبھی کبھی ان کی عقل پر غالب آ جاتی ہے۔ لڑکی کی خوبصورتی نے ان کو بے عقل بنا دیا۔

دونوں نے رائفلیں پھینک دیں اور خنجر نکال لیے۔ ایک ہندو لڑکی نے دو پٹھانوں کو ٹکرا دیا۔ بخت گُل نے بہت تیزی سے طوطی خان پر وار کیے۔ طوطی خان کی گردن اور سینے سے خون بہنے لگا۔ اُس نے کوئی وار نہ کیا۔ وہ وار روکتا رہا۔ پھر اُس نے ایک ہی وار کیا۔ اُس نے بخت گُل کے پیٹ میں خنجر مارا اور اس نے خنجر نیچے کو کھینچ کر اس کا پیٹ چیر دیا۔ بخت گُل نے پھر بھی وار کیا مگر گر پڑا۔ اس کے پیٹ کے اندر سے سب کچھ باہر آگیا۔ طوطی خان بھی بہت زخمی ہو چکا تھا۔ اُس نے دیپ کو کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ ہم سیدھے افغانستان جائیں گے۔ دیپ نے دیکھا کہ طوطی خان بہت زخمی ہے تو وہ بھاگ اُٹھی۔

طوطی خان نے رائفل اٹھائی اور دیپ پر گولی چلائی جو اس کے قریب زمین پر لگی۔ پٹھان کا نشانہ کبھی غلط نہیں جاتا۔ اس نے لڑکی کو ڈرانے کے لیے اس کے قریب گولی چلائی تھی۔ وہ ڈر کر رُک گئی۔ طوطی خان اس کی طرف چل پڑا مگر اس سے اچھی طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ لڑکی پھر دوڑ پڑی۔ طوطی خان نے ایک اور گولی چلائی۔ وہ بھی زمین پر لگی۔ طوطی خان نے اس کو کہا — ”تیسری گولی تمہارے جسم سے پار ہو گی۔ اب بھاگنا نہیں۔“

لڑکی کو غصہ آگیا۔ وہ رُکی رہی۔ طوطی خان آہستہ آہستہ اس کے پاس آگیا۔ طوطی خان کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ لڑکی کے قریب آیا تو رائفل اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ لڑکی نے فوراً رائفل اٹھا لی۔ طوطی خان لڑکی کی نیت سمجھ گیا۔ اس نے لڑکی کو خنجر مارا لیکن وہ اب پاؤں پر کھڑا رہنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے گھٹنے دوہرے ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے خنجر لڑکی کی ران میں لگا اور طوطی خان گر پڑا۔ لڑکی بڑی تیز تھی۔ اس نے رائفل کا ٹریگر دبایا لیکن رائفل خالی تھی۔ طوطی خان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ اُٹھنے لگا تو خنجر ہاتھ سے نکل گیا۔ لڑکی نے خنجر اُٹھا کر اُس کے سینے میں اُتار دیا۔ پھر طوطی خان نہیں اُٹھ سکا۔

لڑکی غار والی جگہ کی طرف چل پڑی۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس

Scanned b qbalmt

جگہ سے بہت دُور ہے۔ وہ خنجر ہاتھ میں اُٹھائے چلتی رہی۔ اس کی ران سے بہت خون نکل رہا تھا۔ وہ دلیر تو ضرور تھی لیکن کمزور لڑکی تھی۔ راستے میں بیہوش ہوگئی اور گر پڑی۔ اسے تلاش کرنے والے ایک آدمی نے اُسے وہاں پڑا دیکھ لیا اور اُٹھا لایا۔

قبیلے کا جرگہ بیٹھا۔ لڑکی نے یہ دلیری دکھائی کہ اس نے صحیح بات بتا دی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ اس نے طوطی خان کو نہیں مارا۔ اس نے دلیری سے بتایا کہ طوطی خان بخت گل کے خنجر کے زخموں سے بچ نہیں سکتا تھا مگر میرے وار نے اس کو جلدی ختم کر دیا۔ یہ سب قصہ سُنا کر لڑکی نے جرگے کو بہت شرمسار کیا اور کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ تم قیدی عورت کو عزت کے ساتھ رکھتے ہو لیکن ادھر ایک پٹھان مجھ کو دو دفعہ اٹھا کر لے گیا اور دوسرے پٹھان نے مجھ پر گولی چلائی۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

جرگے کے چار بزرگ تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ لڑکی آزاد ہے۔ اسے بتوں کے دروازے پر چھوڑ آؤ۔ دو آدمی رات کے وقت اسے بتوں کے دروازے کے قریب چھوڑ کر واپس آ گئے۔ بزرگوں نے اسے تین وجہ سے آزاد کیا تھا۔ ایک یہ تھی کہ دو پٹھانوں نے اس کو اغوا کرنے کی کوشش کر کے پٹھانوں کے قانون کو جس پر انہیں فخر تھا توڑا تھا اور خود ہی ایک دوسرے کو سزا دی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بزرگوں نے کہا کہ یہ لڑکی اتنی خوب صورت اور شوخ ہے کہ اِدھر رہی تو ایک اور خون کرائے گی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی نے اپنی حفاظت کے لیے ان کو آپس میں لڑایا اور طوطی خان کو مارا تھا۔

* * *

کالی بلّی اور لیفٹیننٹ بیلے

یہ کہانی ایک انگریز لفٹیننٹ اور ایک جنگلی سردار کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا میں سب سے زیادہ پسماندہ اور جنگلی ملک افریقہ ہے جہاں ابھی تک انسان بالکل ننگے رہتے ہیں اور وہاں آدم خور انسان بھی ہوتے ہیں۔ میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ ہندوستان میں کہیں کہیں ایسے جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں جو افریقہ کے حبشیوں سے زیادہ جنگلی نہیں تو کم بھی نہیں۔ میں نے ہندوستان کے تین چار جنگلی قبیلوں کی باتیں سُنی تھیں اور ایک قبیلے کو میں نے خود دیکھا تھا۔

جنگ عظیم دوم جو ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی، بہت خوفناک جنگ تھی۔ یورپ اور شمالی افریقہ میں جرمنی نے تباہی مچا دی تھی اور ادھر بحرالکاہل کے تمام جزیروں پر قبضہ کر کے جاپان کی فوج نے اتنا تیز ایڈوانس کیا کہ آج جن کو ملائشیا اور انڈونیشیا کہتے ہیں، ان سب پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ پھر برما سے بھی جاپانیوں نے انگریزوں کو بھگا دیا۔ آگے ہندوستان تھا۔ جاپان کے ہوائی جہازوں نے کلکتہ کی بندرگاہ پر بمباری کی اور یہ دکھائی دینے لگا کہ جاپان ہندوستان پر بھی ہاتھ صاف کر جائے گا۔

ہندوستان کے دفاع کے لئے انگریزوں نے انتظامات کر لئے۔ میں انگریزوں کی ہندوستانی فوج کی سگنل بٹالین میں حوالدار تھا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہاڑیوں پر اور کئی اور جگہوں پر دیکھ بھال کی فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ یہ آبزرویشن پوسٹیں سگنلز کے شعبے کی

تھیں۔ ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ جاپان کی فوج سمندر کے راستے ہندوستان کے ساحل پہ کہیں نہ کہیں ضرور اُترے گی۔

میری بٹالین جنوبی ہندوستان میں میسور کے اُس علاقے میں تھی جو سمندر کے قریب ہے۔ میری بٹالین نے اونچی پہاڑیوں پر پوسٹیں بنا رکھیں تھیں۔ ہمارا رابطہ ایئر فورس کے ساتھ بھی تھا۔ بٹالین کا کیمپ پہاڑیوں سے سات آٹھ میل دُور ایک میدانی جگہ پر تھا۔ یہ تمام علاقہ پہاڑیوں، چٹانوں اور جنگل کی وجہ سے دشوار گذار تھا۔

میں جس پوسٹ پر تھا اس میں ایک انگریز لفٹیننٹ بھی تھا جس کا نام کے۔ اے۔ بیلے تھا۔ اُس کی عمر بائیس تئیس سال تھی۔ میرے علاوہ اس پوسٹ میں تیرہ جوان ہندوستانی تھے۔ لفٹیننٹ بیلے کو ہندوستان میں آتے ایک سال ہو گیا تھا۔ اُس نے اُردو بولنے کی مشق کر لی تھی۔ میں نے اُس کی فطرت دیکھی جو مجھ کو اچھی نہیں لگی۔ اُس کو انگلینڈ سے یہ سبق دے کر بھیجا گیا ہو گا کہ ہندوستانی لوگ انگریزوں کے زر خرید غلام ہیں اور ان کو پاؤں کے نیچے دبا کر رکھنا ہے۔

آپ لکھا کرتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو ناپاک (ملیچھ) سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندو اپنے قریب بیٹھنے نہیں دیتے۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز جو حقارت والا سلوک کرتے تھے وہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ لفٹیننٹ بیلے ہر لحاظ سے اچھا افسر تھا لیکن ہم کو یعنی ہندوستانیوں کو وہ مویشی سمجھتا تھا۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ ہم ہندوستانیوں میں عقل ہوتی ہی نہیں اور انگریز ہندوستان میں نہ آتے تو ہندوستانی لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح گھومتے پھرتے رہتے۔ وہ ہر بات میں ”شہنشاہِ معظم“ کا حوالہ ضرور دیتا تھا مثلاً ـــ ”یہ شہنشاہِ معظم کا قانون ہے ..... ایسا مت کرو، شہنشاہِ معظم ناراض ہو جائے گا ..... تم کو شہنشاہِ معظم تنخواہ اور راشن دیتا ہے“ ـــ معظم کو وہ موازم کہا کرتا تھا۔

ہماری پوسٹ ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ وہاں سے دُور تک

علاقہ نظر آتا تھا لیکن پہاڑیاں، چٹانیں اور درخت ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان کے اندر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن لفٹیننٹ بیلے نے مجھ کو کہا کہ نیچے میس کیمپ میں جانا ہے اور میں بھی اُس کے ساتھ چلوں۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کے پاس ریوالور تھا اور میرے پاس سٹین گن تھی۔ وہاں ہتھیار ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہاں کوئی جنگ نہیں تھی لیکن اُس علاقے میں دھاری دار شیر (ٹائیگر) ریچھ، بھیڑیئے اور لکڑ بگے پائے جاتے تھے۔ کہیں کہیں ہاتھی بھی نظر آتے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔

پہاڑی اُترنے میں ایک گھنٹہ لگ جایا کرتا تھا کیونکہ اس پہاڑی کے کئی حصے تھے۔ میں لفٹیننٹ بیلے کے پیچھے پیچھے پہاڑی سے اُتر رہا تھا۔ ہم آدھی سے زیادہ پہاڑی اُتر چکے تھے کہ بہت تیزی سے کالی گھٹا آ گئی اور اتنی تیز بارش شروع ہو گئی جیسے کنکریوں کی بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں۔ پہاڑیوں پر درخت تھے اور گھاس وغیرہ بھی تھی۔ اس پر پاؤں پھسلتے تھے۔ بارش کے ساتھ بہت ہی تیز جھکڑ چلنے شروع ہو گئے اور بارش طوفانی ہو گئی۔ ہوا کا طوفان درختوں میں سے گزرتا تھا تو بڑی خوفناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ پہاڑیوں کے اندر چیخیں زیادہ ہولناک لگتی تھیں۔

ہمارے لئے اپنی پوسٹ میں جو پہاڑی کی چوٹی پر تھی، واپس جانا بہت مشکل تھا۔ نیچے ہی جانا تھا۔ پہاڑیوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ ایک اور خطرہ پیدا ہو گیا۔ بجلی بڑی زور سے کڑکتی تھی۔ توپ کے فائر کا اتنا دھماکہ نہیں ہوتا جتنا بجلی کے کڑکنے کا تھا۔ مجھ کو یہ خوف تنگ کر رہا تھا کہ میں نے سُنا تھا کہ بجلی درخت پر گرتی ہے۔ ہم درختوں کے نیچے جا رہے تھے۔ بارش اور آندھی کا یہ طوفان قیامت سے کم نہیں تھا۔ پاؤں جما کر اُترنا ناممکن لگتا تھا۔ لفٹیننٹ بیلے میری طرف دیکھتا تو ہنس پڑتا تھا۔

گھٹاؤں نے دن کو رات بنا دیا تھا۔ ہم نیچے پہنچ گئے۔ پانی ہمارے

ٹخنوں سے اُوپر آرہا تھا۔ یہ دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ جگہ تھی۔ اس کی وجہ سے طوفان کی شدّت بڑھ گئی تھی۔ بارش ترچھی ہو کر مُنہ پر کنکریوں کی طرح لگتی اور تکلیف دیتی تھی۔ آنکھیں نہیں کُھلتی تھیں۔ وہ چونکہ جنگ کا کوئی فرنٹ نہیں تھا اس لئے ہمارے سروں پر لوہے کے ہیلمٹ نہیں تھے۔ ہم نے ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ بارش کی شدّت اور ٹھنڈے طوفان کی وجہ سے سر درد شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک چٹان سے مُڑے تو بارش ہمارے پیچھے ہو گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ آنکھیں کُھل سکتی تھیں۔

مجھ کو شک ہُوا کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ بارش اور طوفان نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔ میں اسی کو اللہ کی مہربانی سمجھتا تھا کہ ہم پہاڑی سے خیریت سے اُتر آئے تھے۔ اُترتے ہوئے ہر قدم پر ڈر لگتا تھا کہ پاؤں پھسل جائے گا اور لڑھکتے ہوئے نیچے چلے جائیں گے اور بہت بُری چوٹیں آئیں گی۔ میرے دل میں آتی کہ لفٹیننٹ بیلے کو بتاؤں کہ ہم کسی اور طرف جا رہے ہیں۔ میں کئی مرتبہ پوسٹ سے اُتر کر بیس تک گیا تھا۔ بارش میں اچھی طرح دکھائی تو نہیں دیتا تھا پھر بھی مجھ کو وہ راستہ غلط معلوم ہوتا تھا۔ میں نے لفٹیننٹ بیلے کو اس وجہ سے نہ بتایا کہ وہ کہہ دے گا کہ تم دیسی لوگ بے عقل ہوتے ہو۔

بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی۔ بارش ذرا کم ہو گئی اور کچھ دُور تک نظر آنے لگا۔ طوفانی ہوا کا زور پہلے جتنا رہا۔ تقریباً ایک سو گز دور سفید شعلہ چمکا اور ایک لکیر آسمان سے زمین تک چمکی۔ اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھیں بند ہو گئیں اور بند آنکھوں میں بھی یہ چمکتی ہوئی لکیر موجود رہی۔ اس کے ساتھ ہی اتنی زور کا دھماکہ ہُوا جیسے بیس پچیس توپوں نے اکٹھے فائر کیا ہو۔ ایک سو گز دُور ایک اُونچا درخت تھا۔ شعلہ اس درخت میں چمکا اور دو یا تین ٹہن کڑکڑ کی آواز پیدا کرتے ٹوٹے اور زمین پر گر گئے۔ یہ بجلی تھی جو درخت پر گری تھی۔ اس طرح معلوم ہُوا کہ زمین زلزلے کی طرح ہل گئی تھی۔ میں تو بہت ہی ڈر گیا۔ میرا خیال ہے کہ لفٹیننٹ بیلے بھی ڈر گیا تھا۔ میری حالت یہ ہو گئی کہ درختوں کے نیچے سے گزرتے وقت میرے دل پر گھبراہٹ آ جاتی تھی۔ بہت دیر تک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا رہا۔

بارش اور کم ہو گئی اور کم ہوتے ہوتے پھوار بن گئی۔ گھٹائیں آگے چلی گئیں لیکن آسمان صاف نہ ہُوا۔ لفٹیننٹ بیلے نے کہا کہ ہم شاید ٹھیک راستے پر نہیں جا رہے۔ ہمارے دونوں طرف چٹانیں اور اُن کے پیچھے پہاڑیاں تھیں۔ علاقہ میدانی ہوتا تو دُور تک نظر آ جاتا۔ وہاں یہی ایک طریقہ تھا کہ ہم کسی اونچی پہاڑی پر چڑھ جاتے اور ہر طرف دیکھ کر معلوم کرتے کہ ہم کہاں ہیں۔

لفٹیننٹ بیلے آگے چلتا گیا اور میں اس اُمید پر اُس کے پیچھے چلتا رہا کہ وہ صحیح راستے پر پہنچ جائے گا۔ آگے چٹانیں اور پہاڑیاں ایسی شروع ہو گئیں کہ ایک دوسرے کے قریب قریب تھیں اور ان کی شکل و صورت کچھ اور ہی ہوتی جا رہی تھی۔ بعض پر بہت تھوڑے درخت تھے اور کچھ چٹانیں بالکل ننگی تھیں۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی قلعے کے کھنڈروں میں گزر رہے ہوں جہاں دیواریں بھی ہوں اور ملبے کے بہت اُونچے ڈھیر بھی۔

بارش تھم گئی تھی۔ اچانک اتنے موٹے اور وزنی اولے پڑنے لگے جن کا وزن نصف پاؤ کے لگ بھگ ضرور ہو گا۔ یہ زیادہ نہیں تھے۔ لفٹیننٹ بیلے چلتے چلتے رُک گیا۔ ذرا سا ڈولا اور گھٹنوں کے بل ہو گیا۔ اُس کے سر پر دو تین اولے لگے تھے۔ میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ فوراً بعد دو اولے میرے سر پر اتنی زور سے لگے جیسے کسی نے پہاڑی کی چوٹی سے پتھر مارے ہوں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ ہمارے سروں پر ٹوپیاں (بیرٹ) تھیں جو ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی تھیں۔

میری آنکھوں کے آگے سے اندھیرا ہٹا تو لفٹیننٹ بیلے مجھ کو

اُٹھا رہا تھا۔ تب مجھ کو پتہ چلا کہ میں غش کھا کر گر پڑا تھا۔ میں اُٹھا تو سر چکرا رہا تھا۔ بڑے اولے بند ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے اولے پڑنے لگے۔ لفٹیننٹ بیلے نے مجھ سے پوچھا کہ میں ٹھیک ہوں؟ میں نے کہا کہ ٹھیک ہوں لیکن میں ٹھیک نہیں تھا۔ لفٹیننٹ بیلے خود بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اُس کے قدم لڑکھڑاتے تھے۔ میری حالت بھی یہی تھی۔ ہم دونوں نیم بیداری کی حالت میں تھے اور چل رہے تھے۔ ہمیں دائیں بائیں کا ہوش نہیں تھا۔

ہمارے ہوش اُس وقت ٹھکانے آئے جب تیز بہتے ہوئے پانی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ جگہ تھی۔ بارش کا سیلابی پانی بہت تیز بہہ رہا تھا۔ ہم گھٹنوں تک پانی میں تھے۔ پانی کے زور سے ہمارے پاؤں اُکھڑ رہے تھے۔ ہم آگے چلے گئے اور پانی ہمارے ٹخنوں تک رہ گیا۔ وہاں سے ہم کدھر گئے اور کہاں کہاں بھٹکتے رہے، مجھ کو خواب کی طرح یاد رہ گیا ہے۔ سر پر جو وزنی اولے لگے تھے، اُنہوں نے دماغ ہلا دیا تھا۔

اولے جلدی بند ہو گئے تھے۔ بارش بالکل تھم گئی۔ گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ ہم سات بجے کے قریب پوسٹ سے چلے تھے۔ چار گھنٹے گزر گئے تھے اور پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم کدھر نکل آئے ہیں۔ موسم صاف ہو گیا۔ ایک پہاڑی میں ایسی جگہ نظر آئی جو قدرتی طور پر برآمدے کی طرح بنی ہوئی تھی۔ وہاں خشکی تھی۔ وہ جگہ بارش سے محفوظ رہی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ تھکن اور ٹھنڈ سے ہماری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہم اگر سیاح یا شکاری ہوتے تو اور بات تھی۔ ہم فوجی تھے۔ ہمیں فوراً واپس جانا تھا۔ پہاڑی پہ ہماری جو سگنل اور آبزرویشن پوسٹ تھی، اس کا ذمہ دار لفٹیننٹ بیلے تھا۔ اُس کے بعد میری ذمہ داری تھی لیکن ہم دونوں معلوم نہیں کہاں بیٹھے تھے۔ ہمارے خلاف کارروائی ہو سکتی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ لفٹیننٹ بیلے گھبرایا ہوا نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ ایسی باتیں کرتا رہا جن سے میرا حوصلہ قائم رہا۔

ہماری وردی سے پانی بہہ رہا تھا۔ بوٹوں کے اندر پانی چلا گیا تھا۔ ہم نے بوٹ اتار کر ان میں سے پانی نکالا۔ جرابیں نچوڑیں اور پھر انہیں پہن لیا۔ آدھے گھنٹے سے ذرا زیادہ آرام کر کے ہم چل پڑے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ گھٹائیں بہت دُور چلی گئی تھیں۔ ہوا کی تیزی بہت کم ہو گئی تھی۔ سر میں اُس جگہ درد ہو رہا تھا جہاں دو تین وزنی اولے پڑے تھے۔

آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہر طرف پہاڑیاں اور چٹانیں تھیں اور درخت زیادہ تھے۔ ان کے سوا زمین کا اور کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آسمان پر گھرے بادل تھے اس لئے سورج کا پتہ نہیں لگتا تھا کہ کس طرف ہے۔ ہم سورج سے اپنے بیس کیمپ کی سمت معلوم کر سکتے تھے۔ لفٹیننٹ بیلے کے پاس کمپاس ہونی چاہیئے تھی لیکن وہ ساتھ نہیں لایا تھا۔

ہم اُٹھے اور اس اُمید پہ چل پڑے کہ کہیں راستہ مل جائے گا یا کسی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھیں گے، شاید اپنی پوسٹ نظر آ جائے۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان جا رہے تھے۔ تین چار موڑ مُڑنے پڑے اور ہم ڈیڑھ میل کے قریب فاصلہ طے کر گئے۔ سیلابی پانی کہیں گھٹنوں تک تھا اور کہیں پھیل کر اس سے کم گہرا ہو جاتا تھا۔

آخر میں دونوں پہاڑیاں آپس میں مل گئیں۔ ان کے درمیان اتنا سا راستہ تھا جس میں سے دو آدمی اکٹھے گزر سکتے تھے۔ ہم اس میں سے گزر کر آگے گئے تو سامنے ایک چٹان کھڑی تھی۔ دائیں طرف اس چٹان نے پہاڑی سے مل کر راستہ روکا ہوا تھا۔ ہم بائیں طرف ہو گئے۔ چٹان زیادہ لمبی نہیں تھی۔ جہاں یہ ختم ہوتی وہاں سے ہم مُڑ گئے اور ہمارے سامنے بہت وسیع میدان آ گیا جو پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ درخت بھی تھے اور گھاس نے تمام زمین کو ڈھانپا ہوا تھا۔

لفٹیننٹ بیلے نے مجھ کو کہا کہ اِدھر شاید کوئی گاؤں ہو یا جنگلی لوگ کہیں رہتے ہوں، وہ ہمیں راستہ بتا دیں گے۔ ہم اس امید پہ کہ کوئی مل

جاتے گا، میدان کی طرف چل پڑے۔ زمین پتھریلی تھی۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلنے گئے۔ دو تین فرلانگ چلے گئے تو ہمیں ڈھول بجنے کی آواز بڑی دھیمی سنائی دینے لگی۔ پہلے میں سمجھا کہ ہوا کی آوازیں ہیں یا سردی سے میرے کان بج رہے ہیں۔ میں نے لفٹیننٹ بیلے کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا کہ کوئی گاؤں ہے، تیز چلو۔

ہم تیز چلنے لگے۔ ڈھول کی آواز اُونچی اور صاف ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے آدمی ڈھول کی تال پر گا رہے ہوں۔ ہم جس پہاڑی کے دامن کے ساتھ جا رہے تھے، وہ آگے جا کر مُڑ جاتی تھی۔ وہاں تک پہنچے تو ہمارے بائیں طرف خواب کی طرح منظر دکھائی دیا۔ پندرہ سولہ جھونپڑے تھے جو ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ یہ نئے چاند کی طرح آدھے سے ذرا کم دائرے میں تھے۔ ان کے درمیان بہت سے آدمی اور عورتیں گول دائرے میں ناچ کے انداز سے چل رہے تھے۔ عورتوں کے جسموں پر ساڑھیوں کی طرح کے لباس تھے۔ مردوں کا لباس دھوتیاں اور بنیانیں تھا۔ عورتوں اور مردوں نے گلے میں درختوں کے پتوں کے ہار ڈال رکھے تھے۔ بعض عورتوں نے سروں کے گرد پھول لپیٹے ہوتے تھے۔ ان کے درمیان تین ڈھول تھے۔ ایک بڑا، دوسرا اس سے چھوٹا اور تیسرا طبلے کی شکل اور سائز کا تھا۔

ان کا ناچ دھماچوکڑی کی طرح نہیں بلکہ ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔ وہ سب کوئی گیت گا رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد زور سے "ہاہ" کہتے تھے۔

ہم اُن کے قریب گئے تو دیکھا کہ ناچنے والوں کے دائرے کے درمیان میں جہاں ڈھول بج رہے تھے، ایک آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اُٹھا اور اُس نے ناچنے والوں کو بلند آواز میں کچھ کہا۔ وہ

دائرے میں سے نکل کر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اُس کی عمر ساٹھ سال سے اُوپر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی دھوتی دوسروں سے زیادہ صاف تھی۔ اُس کا اُوپر کا جسم ننگا تھا۔ اُس نے گلے میں مختلف پرندوں کے رنگا رنگ پروں کا ہار پہنا ہوا تھا۔ اُس کے سر پر ریشمی کپڑا لپٹا ہوا تھا اور پرندوں کے چار پانچ رنگ برنگے پروں کی کلغی اُڑسی ہوتی تھی۔ اُس کا حلیہ بتاتا تھا کہ یہ شخص ان لوگوں کا سردار ہے۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور چہرے کے نقش اچھے تھے۔

باقی آدمی اور عورتیں بدستور ناچ رہے تھے۔ ان سب کے رنگ گندمی یا سانولے تھے۔ پہاڑیوں کی طرف سے تین تین چار چار کی ٹولیوں میں آدمی چلے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ یہ ان کی کوئی تقریب تھی یا کوئی تہوار تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اِن کا سردار جو ہمارے سامنے کھڑا تھا، اُردو بول رہا تھا۔ اُس کا لہجہ اُردو والا نہیں تھا اور وہ صحیح اُردو بھی نہیں بولتا تھا لیکن یہ پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لفٹیننٹ بیلے کی اُردو اُس سے زیادہ خراب تھی۔ میرا لفٹیننٹ صاحب بہادر بات کر رہا تھا اس لئے میں نہیں بول سکتا تھا۔ یہ فوجی ڈسپلن کے خلاف تھا کہ میں اپنے سوال جواب شروع کر دیتا۔

ان دونوں کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ میں اپنی زبان میں سنا دیتا ہوں۔ سردار نے ہمیں کہا کہ ہم وہاں سے چلے جائیں کیونکہ یہ ان کی ایسی تقریب یا عبادت ہے جس میں باہر کا کوئی آدمی تماشائی کے طور پر بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم دو میل دُور کھڑے ہو کر دیکھیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لفٹیننٹ بیلے نے اُس کے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کیں اور اُس سے پوچھا کہ یہ تقریب کیا ہے۔ سردار نے بتایا کہ یہ ایک خاص عبادت ہے جو ہر چوتھے چاند گرہن کے بعد کی جاتی ہے۔ اُس نے اس عبادت

کا طریقہ یہ بتایا کہ چاند کو جب چوتھی مرتبہ گرہن لگ جاتا ہے تو اس عقیدے کے تمام لوگ اپنی نوجوان لڑکیوں کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس لڑکی میں بلوغت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اُسے سردار کے پاس لے جاتے ہیں۔ سردار اُسے خاص لباس پہنا دیتا ہے۔ پھر اس عقیدے کے تمام لوگ اس لڑکی کو مقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر طوفانی بارش کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اگر بجلی بڑے زور سے کڑکے جیسے اُس روز کڑک رہی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دیوتا غصے میں ہیں اور وہ قربانی مانگ رہے ہیں۔ جونہی بارش رُکتی ہے، لڑکی کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ قربانی کا طریقہ یہ بتایا کہ لڑکی کو میٹھا پانی پلایا جاتا ہے جس میں بے ذائقہ زہر ملا ہوا ہوتا ہے۔ لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ سو جاتی ہے اور پندرہ منٹ بعد اُس کی جان نکل جاتی ہے۔

مرنے کے بعد لڑکی کا دل نکالا جاتا اور ایک بلّی کو جو عبادت گاہ میں رہتی ہے، کھلا دیا جاتا ہے۔ اس بلّی کو وہ لوگ دیوتاؤں کی بلّی سمجھتے تھے۔ لڑکی کی کھوپڑی عبادت گاہ میں رکھ دی جاتی تھی۔

لفٹیننٹ بیلے نے جب لڑکی کی قربانی کی بات سُنی تو وہ بھڑک کر بولا کہ یہ قتل ہے۔ سردار نے اس کو بتایا کہ یہ ان کا مذہب ہے۔ اگر وہ دیوتاؤں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش نہ کریں تو اُن کی پھینکی ہوئی بجلیاں اُن کو، اُن کے گھروں کو اور اُن کے بچوں کو جلا ڈالیں۔

لفٹیننٹ بیلے کے دماغ میں بادشاہی کا اور ”شہنشاہِ معظم“ کے قانون کا کیڑا جاگ اُٹھا۔ اُس نے ریوالور نکال لیا اور غصے سے کہنے لگا کہ اِدھر انگریزوں کا قانون لاگو ہے۔ اگر کسی لڑکی کو جان سے مارا گیا تو سردار کو اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے عدالت میں سزائے موت دلائی جائے گی۔

سردار نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا کہ اُس کے قبیلے پر انگریزی قانون لاگو نہیں ہوتا اور وہ صرف اپنے دیوتاؤں کے قانون اور حکم کو

مانتے ہیں۔ سردار نے مجھ کو کہا کہ میں اس انگریز کو سمجھاؤں کہ یہ ہمارے مذہب میں دخل نہ دے۔ میں نے عرض کرنے کے لہجے میں لفٹیننٹ بیلے سے کہا کہ ہمیں کیا، یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں انہیں کرنے دیں۔

لفٹیننٹ نے مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور کہنے لگا کہ یہ لوگ کسی کی بیٹی کو قتل کر رہے ہیں۔ میں یہ جُرم نہیں ہونے دوں گا۔

اس نے سردار کو بادشاہوں کی طرح حکم دیا کہ وہ اُس لڑکی کو سامنے لائے جسے وہ قربان کر رہا ہے۔ سردار نے اُس کو ایک مرتبہ پھر کہا کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے عقیدے میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرے گا۔ لفٹیننٹ بیلے نے مجھے کہا کہ سٹین گن میں میگزین لگا لو۔ میں ان سے لڑکی لے کر ہی رہوں گا۔ ان جنگلیوں کو میں دکھاؤں گا کہ یہاں انگریزی قانون چلتا ہے اور یہ شخص اپنا حکم نہیں چلا سکتا۔

میں نے پوچ سے ایک میگزین نکال کر سٹین گن میں لگا لی۔ سردار نے سٹین گن کی طرف دیکھا پھر لفٹیننٹ بیلے کے ریوالور کو دیکھا اور پھر پیچھے اپنے قبیلے کو دیکھا۔ وہ سب ابھی تک ناچ رہے تھے۔ اسی نسل اور حلیے کے تماشائی بڑھ گئے تھے۔ سردار نے کسی کو پکارا۔ دو آدمی دوڑے آئے۔ سردار نے اُن کو نہ جانے اپنی زبان میں کیا کہا۔ دونوں آدمیوں نے سر ہلاتے اور ہماری طرف دیکھا۔

”لڑکی یہاں نہیں“ — سردار نے لفٹیننٹ بیلے سے کہا — ”اُس کو یہاں سے دُور ایک غار میں رکھا ہوا ہے۔ جس لڑکی کو قربان کرنا ہوتا ہے اُسے اُس غار میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ لڑکی بھی غار میں ہے۔ تم دونوں میرے ساتھ اُس غار تک چلو اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ لیکن یہ سوچ لو کہ دیوتاؤں کی قربانی کو تم نے اپنے قبضے میں لے لیا تو جو تباہی ہماری ہوگی وہی تمہاری ہوگی .... آؤ۔“

وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ چل پڑا اور اُس کے اشارے پر ہم اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ راستے میں اُس نے رُک کر ایک مرتبہ

پھر لفٹیننٹ بیلے کو کہا کہ صاحب، لڑکی کو قربانی سے بچانے کی غلطی نہ کرو، پچھتاؤ گے۔ تم ہم کو ڈرا کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے مگر دیوتا تم سے نہیں ڈریں گے۔

لفٹیننٹ بیلے نے کہا کہ ہم لڑکی کو اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔ ہم اسے پولیس کے سپرد کر کے کہیں گے کہ اس لڑکی کی حفاظت کرو۔

اس کے بعد سردار نے کچھ نہ کہا۔ وہ آگے آگے چلتا رہا۔ ایک ذرا کم اونچی پہاڑی ہمارے بائیں طرف تھی۔ سردار اس کے قریب ہو گیا۔ اس پہاڑی کے ساتھ ساتھ چٹانیں آ گئیں۔ سردار ہم کو ان کے اندر لے گیا۔ پھر معلوم نہیں کہ کدھر کدھر مڑتا گیا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ وہ بہت تیز چل رہا تھا۔

کم از کم پون گھنٹہ چلنے کے بعد وہ رک گیا اور اس نے نصف میل دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پہاڑی کے پیچھے چلے جاؤ" — اس نے لفٹیننٹ بیلے سے کہا — "اس کے پیچھے ایک اور پہاڑی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کھلی جگہ ہے۔ ایک جگہ پانی کا تالاب بنا ہوا ہو گا۔ اس کے اور پچھلی پہاڑی کے دامن کے درمیان تھوڑا سا راستہ ہے۔ تم آسانی سے وہاں تک چلے جاؤ گے۔ پہاڑی کے دامن سے ذرا اوپر دیکھنا۔ تم کو جھاڑیاں نظر آئیں گی۔ ان میں چھپا ہوا ایک غار کا دہانہ ہے۔ یہ تنگ سا ہے۔ تم دونوں بیٹھ کر اس کے اندر جا سکتے ہو۔ لڑکی اندر بیٹھی ہوئی ہو گی۔ اس کے ساتھ دو عورتیں ہیں۔ تم لڑکی کو لے جانا۔"

"تم خود وہاں تک کیوں نہیں چلتے؟" — لفٹیننٹ بیلے نے پوچھا۔

"اگر میں تمہارے ساتھ وہاں تک گیا تو یہ میرا گناہ ہو گا" — سردار نے کہا — "میں نے لڑکی کو تمہارے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تو بھی یہ میرا گناہ ہو گا جو دیوتا مجھ کو معاف نہیں کریں گے.... تم جاؤ، میں واپس جا رہا ہوں۔ اب میری باقی عمر دیوتاؤں سے یہ گناہ معاف کرانے کے لئے

عبادت میں گزرے گی یا میں واپس پہنچتے ہی تباہی کا شکار ہو جاؤں گا۔"

وہ اپنے دونوں آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔ لفٹیننٹ بیلے چہرے سے بہت خوش نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی بادشاہی کا حکم منوا لیا تھا۔ میرے لئے یہ معاملہ بہت ہی عجیب تھا۔ میں نے اس طرح بھی محسوس کیا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

ہم دونوں پہاڑی کے پیچھے چلے گئے۔ وہاں تک پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگ گیا تھا کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا اور وہاں کھڈ زیادہ تھے جن میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ بہت بڑے بڑے پتھر بھی تھے۔ اس پہاڑی کے پیچھے ایک اور پہاڑی تھی یعنی ہمارے دونوں طرف پہاڑیاں تھیں اور ان کے درمیان تیس چالیس قدم کا فاصلہ تھا۔ بارش کا پانی ابھی تک بہہ رہا تھا۔ چار پانچ فرلانگ آگے گئے تو ایک جگہ سے پہاڑی ذرا پیچھے چلی گئی تھی۔ اس جگہ پانی تالاب کی طرح جمع تھا اور یہ تالاب تیس گز کے قریب چوڑا تھا۔

ہم دونوں تالاب اور پہاڑی کے درمیان چلے گئے۔ یہ تنگ سا راستہ تھا۔ وہاں رک کر دیکھا۔ پہاڑی کے دامن سے دو تین گز اوپر جھاڑیاں تھیں۔ غار کو وہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں نے سٹین گن کا سلنگ گلے اور کندھے میں ڈال لیا اور لفٹیننٹ بیلے نے ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا۔ وہاں ہتھیاروں کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم کو بتایا گیا تھا کہ غار میں لڑکی اور دو عورتیں ہیں۔

ہم تین چار قدم اوپر جھاڑیوں تک گئے۔ ان کے پیچھے غار کا منہ نظر آیا جو دائیں بائیں کو لمبوترا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے آگے بڑھے اور بیٹھ کر غار کے منہ میں جھانکا۔ اندر سے ایسی بدبو آتی جو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ آوازیں ایسی آئیں جیسی کتے کے بچوں کی ہوتی ہیں۔ لفٹیننٹ بیلے نے زور سے کہا کہ اندر کون ہے، باہر آؤ۔

اس آواز پر غار سے اتنی خوفناک آواز آئی کہ ہم دونوں پیچھے کو گرے۔ یہ شیر کے غرانے کی آواز تھی لیکن گرج کی طرح۔ ہم جلدی سے اٹھے اور اس کے ساتھ ہی ایک دھاری دار شیر جو اس علاقے میں عام

ملتا تھا، غار میں سے نکلا۔ ہم میں اور شیر میں فاصلہ تین چار قدم تھا۔ بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ خدائی مدد میرے ساتھ تھی۔ میں اُس کو معجزہ کہا کرتا ہوں کہ ہم دونوں دائیں بائیں بھاگنے کی بجائے اُلٹے قدم پیچھے کو ہوئے۔ یہ ڈھلان تھی۔ ہم گرے اور پانی میں جا پڑے۔ پانی گہرا تھا۔ اب مجھے لفٹیننٹ بیلے کا پتہ نہیں تھا کہ کدھر ہے۔

میں تیز تیز تیرنے لگا۔ پانی میں کوئی وزنی چیز گری پھر شیر کا غرّانا میرے کانوں میں پڑا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا تو شیر تیرتا ہُوا میرے بہت قریب آگیا تھا۔ اُس کا ایک پنجہ میری پیٹھ پر پڑا۔ ایسے پتہ چلا کہ میری کھال اُتر گئی ہے۔ میں نے ڈبکی لگا دی اور پانی کے اندر اندر دوسری طرف نکل گیا۔ اس طرح شیر کے دوسرے پنجے سے بچ گیا۔ میں نے پانی سے سر نکالا تو شیر مجھ سے دو گز سے ذرا زیادہ دُور تھا اور تیرتے ہوئے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ لفٹیننٹ بیلے مجھ کو دکھائی دیا۔ وہ میرے دائیں طرف شیر سے دُور تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے تیرتے ہوئے شیر پر ریوالور کی گولی چلائی۔

شیر بہت زور سے دھاڑا اور لفٹیننٹ بیلے کی طرف گیا۔ سٹین گن میرے گلے سے لٹک رہی تھی۔ اس میں میگزین بھی لگی ہوئی تھی مگر اُسے فائر کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ اگر میں فائر کرتا تو تیر نہیں سکتا تھا۔ میں نے پاؤں نیچے لگائے لیکن پانی سر سے اُوپر ہو گیا۔ لفٹیننٹ بیلے کو میں نے دیکھا۔ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ شیر اُس کے پیچھے تھا۔

پھر ایسے ہُوا کہ لفٹیننٹ بیلے، میں اور شیر ایک ہی وقت دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ مجھ کو صاف نظر آیا کہ شیر کے ایک کندھے سے یا پیٹھ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں شیر دل کی عادتوں سے واقف نہیں تھا۔ یہ سُنا تھا کہ شیر زخمی ہو جاتے تو بہت ہی خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔

پانی سے نکل کر شیر پہلے میری طرف آیا۔ میں نے بڑی تیزی سے سٹین گن گلے سے اُتار کر ہاتھوں میں لی۔ شیر اس طرح زمین سے اٹھا جس طرح پرندہ اُڑتا ہے۔ مجھ کو فوجی ٹریننگ نے پھرتیلا بنایا ہُوا تھا۔ میں دائیں طرف گرا اور پانی میں جا پڑا۔ وہاں گہرا پانی نہیں تھا۔ لفٹیننٹ بیلے کا ریوالور ایک بار پھر فائر ہُوا۔ میں اُٹھا تو شیر زمین پر گر کر اُٹھا۔ وہ پیچھے مُڑ رہا تھا۔ میں نے سٹین گن ہپ کے ساتھ لگا کر اُس پر آدھی میگزین فائر کر دی۔ اُس نے سر اُٹھایا اور اُٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اُٹھ سکا۔ اس کا سر بھی گر پڑا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ شیر کے قریب گئے۔ لفٹیننٹ بیلے نے اُسے دو تین پتھر مارے کہ پتہ چل جائے کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ شیر نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی۔ ہم نے اُسے قریب جا کر دیکھا۔ مر گیا تھا۔

اُس کے جسم سے بہت ساری گولیاں پار ہو گئی تھیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ شیر نہیں شیرنی تھی اور اس کے تھنوں میں دُودھ آیا ہُوا تھا۔ لفٹیننٹ نے کہا کہ یہ بچّوں والی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ اُدھر دیکھو، وہ اس کے بچے ہیں۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ غار دراصل شیر کی کچھار تھی۔ اس کے سامنے شیرنی کے دو بچے جو بہت چھوٹے تھے، جھاڑیوں کے پاس کھڑے تھے۔ وہ اپنی ماں کے پیچھے باہر نکل آتے تھے۔

لفٹیننٹ بیلے نے کہا کہ یہ دونوں بچے اٹھا کر لے چلتے ہیں۔ بچے تالاب کے پار تھے۔ مجھ کو غصہ آگیا۔ میں نے اُس کو کہا کہ پہلے ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔ اب بچّے اٹھانے چل پڑیں تو معلوم نہیں کیا مصیبت آ پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کو میری بات سمجھ آگئی۔ میں نے اُس کو کہا کہ جنگلی سردار نے ہم کو کوئی اور غار بتائی تھی لیکن ہم شیر کی غار میں چلے گئے۔ میں نے کہا کہ لعنت بھیجو ان جنگلیوں پر اور نکلو اِس مصیبت سے۔ میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ دل دھک دھک کر رہا تھا اور گھبراہٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

لفٹیننٹ بیلے کا دماغ دوسری طرف چلا گیا۔ وہ کہنے لگا کہ تم کو معلوم نہیں کہ جن کو ہم جنگلی کہتے ہیں، وہ کتنے ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ سردار نے ہم کو اسی غار میں بھیجا تھا۔ اس کے سامنے پانی جمع ہے اور باقی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ سردار نے ہمیں شیر سے مروانے کے لئے اِدھر بھیجا تھا

یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ کمزور سی کُتیا جب بچے دیتی ہے تو شیرنی بن جاتی ہے۔ یہ تو شیرنی تھی۔ سردار جنگل کے راز جانتا تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ شیرنی نے بچے دیتے ہوتے ہیں اور وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ ہم سیدھے شیرنی کی کچھار میں چلے گئے تھے۔ میں نے لفٹیننٹ بیلے کو کہا کہ شیرنی اکیلی تھی۔ اُس نے کہا کہ شیر کہیں دُور ہو گا۔

اُس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ دُور سے ہمیں شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ لفٹیننٹ بیلے نے کہا کہ چلو یہاں سے بھاگیں۔ ان بچوں کا باپ آرہا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے یہ نہیں کہا کہ ٹھہرو، اس شیر کو بھی مار کر چلیں گے۔ ہم دونوں وہاں سے بہت تیز چل پڑے۔ بہت دُور آکر ہم نے پیچھے دیکھا تو ہمیں شیر نظر آیا۔ وہ مری ہوئی شیرنی کو سُونگھ رہا تھا۔ ہم اُس جگہ سے مُڑ گئے جہاں یہ پہاڑی ختم ہوتی تھی۔ ہم بار بار پیچھے دیکھتے تھے کہ شیر ہمارے پیچھے نہ آرہا ہو۔

میں سمجھتا تھا کہ لفٹیننٹ بیلے کا دماغ درست ہو گیا ہے لیکن اُس کے دماغ میں پھر بادشاہی آگئی۔ کہنے لگا کہ وہ اس جنگلی سردار کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہ غصے میں آیا ہُوا تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اُس کو کچھ کہتا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

آخر یہ فاصلہ طے ہُوا اور ہم سردار کے گاؤں تک پہنچ گئے۔ اب وہاں پہلے سے زیادہ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں بعض کے اُوپر کے جسم ننگے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر آدمیوں کے ہاتھوں میں برچھیاں

تھیں۔ اب ناچ میں مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ تو میلے کا منظر تھا۔ ہم اُن کے قریب جا کر رُک گئے۔ لفٹیننٹ بیلے نے مجھ کو کہا کہ میں ان کے سردار کو بلا لاؤں۔

میں آگے گیا تو سردار خود ہی آگیا۔ اُس پر مجھ کو بھی بہت غصہ تھا۔ میں نے اُس کو پنجابی زبان میں دو تین گالیاں دے کر کہا کہ تُجھے صاحب بلاتا ہے۔ وہ اِدھر آنے کی بجائے اپنے لوگوں میں چلا گیا۔ میرا غصہ بڑھ گیا لیکن وہ جلدی واپس آگیا اور میرے ساتھ لفٹیننٹ بیلے کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

”وہ لڑکی کدھر ہے؟“ —— لفٹیننٹ بیلے نے اُس سے پوچھا اور اُسے انگریزی کی گالیاں دیں۔

”وہ دیوتا کے نام پر قربان ہو چکی ہے“ —— سردار نے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا —— ”وہ دیکھو میری کالی بلی۔ وہ لڑکی کا دل کھا رہی ہے۔“

ہم نے اُدھر دیکھا۔ چار لکڑیوں پر مچان جیسا عارضی چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ اُس پر شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک کالی بلی بیٹھی کچھ کھا رہی تھی۔ لفٹیننٹ بیلے نے اُس سے نہ پوچھا کہ لڑکی کی لاش کہاں ہے۔ اُس کو اتنا غصہ آگیا کہ بات کرتا تھا تو اس کے مُنہ سے تھوک اُڑتا تھا۔ اُس نے سردار کو کہا کہ تم نے ہم کو شیرنی کی کچھار میں بھیج دیا تھا کہ وہ ہم کو مار کر کھا جائے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں قتل اور دھوکہ دہی کے جُرم میں سزا دلائیں گے۔

سردار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چُپ چاپ کھڑا لفٹیننٹ بیلے کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ لفٹیننٹ بیلے نے ریوالور نکال لیا اور اُس کی نالی جنگلی سردار کے مُنہ کے آگے لہرا لہرا کر اس پر غصہ جھاڑنے لگا۔ میں نے جنگلی لوگوں کی طرف دیکھا تو میرا دم خشک ہو گیا۔ کم از کم ایک سَو جنگلی آدمی ہاتھوں میں برچھیاں اُٹھائے دُور دُور ایک دوسرے کے پیچھے دو

طرف سے دائرے کی شکل بنا رہے تھے۔ وہ ہم کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ میں نے لفٹیننٹ بیلے کو بتایا۔ اُس نے اُدھر دیکھا تو سردار سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔

"یہ تم دونوں کے گرد گھیرا ڈال کر اکٹھے آگے آئیں گے"— سردار نے بڑے آرام سے کہا —"تم ایک پستول اور ایک مشین گن (اسٹین گن) سے میرے کتنے آدمیوں کو مار لو گے۔ یہ لوگ تم دونوں کی بوٹی بوٹی کر دیں گے .... اب بھی وقت ہے۔ تم چلے جاؤ۔ اِدھر تمہارے بادشاہ کا نہیں ہمارے دیوتا کا حکم چلتا ہے۔"

ابھی گھیرا مکمل نہیں ہُوا تھا۔ لفٹیننٹ بیلے نے ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا اور اپنا غصہ قائم رکھتے ہوتے بولا —"ہم جاتا ہے۔ تم کو ہم ٹھیک کر دے گا"— وہ مجھے چلنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔

میں نہ چلا۔ میں نے سردار کو کہا کہ ہم دراصل اپنے کیمپ کا راستہ بھول گئے تھے۔ ہمیں راستہ بتاؤ۔ اُس نے کہا کہ تم بہت دُور نہیں آتے۔ میں اپنا آدمی تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ تم کو راستے پر ڈال آئے گا لیکن میرا آدمی مجھ کو زندہ واپس ملنا چاہیئے۔ میں نے لفٹیننٹ بیلے کے ساتھ بات کی تو اُس نے کہا —"ٹھیک ہے"— انگریز ایسا ہی جواب دیا کرتے تھے۔

جنگلیوں کا گھیرا رُک گیا۔ سردار نے ایک آدمی کو بُلا کر کچھ کہا اور وہ آدمی ہمارے آگے آگے چل پڑا۔ وہ پہاڑیوں کے درمیان چلتا گیا اور موڑ مُڑتا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چل کر وہ رُک گیا اور اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ اُردو نہیں بول سکتا تھا۔ ہم نے آگے ہو کر دیکھا۔ تقریباً ایک میل دُور مجھ کو اپنے کیمپ کے اُونچے ایریَل نظر آتے۔ وہ جنگلی واپس چلا گیا۔

ہم کیمپ میں پہنچے۔ ہمارا کمانڈر ایک انگریز میجر گوڈون تھا۔ لفٹیننٹ نے مجھ کو اپنے ساتھ رکھا اور میجر گوڈون کو انگریزی میں سُنانے لگا جو

ہم پر گزری تھی۔ میں دس جماعت پاس تھا۔ اُس کی ہر بات مجھ کو سمجھ آ رہی تھی۔ اُس نے میجر سے کہا کہ اِن جنگلیوں کو گرفتار کیا جاتے۔ انہوں نے ایک لڑکی کو قتل کیا ہے۔

میجر مسکراتا رہا۔ اُس نے لفٹیننٹ کو سمجھانا شروع کر دیا کہ اِس ملک میں بہت سے ایسے لوگ آباد ہیں جو افریقہ کے حبشیوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم ان کو نہیں چھیڑتے۔ میجر گوڈون نے بتایا کہ جاپان نے برما، سنگاپور، ملایا وغیرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان ملکوں کے جنگلوں میں ایسے ہی قبیلے آباد ہیں۔ ان سب نے جاپانی فوج کی بہت مدد اور راہنمائی کی تھی، اس لئے ہندوستان میں ہمارے لئے محتاط ہونا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ ان کو آزاد رہنے دو۔

لفٹیننٹ بیلے خاموش ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ غصہ ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا

* * *

بب ڈوری کے شیر، مہاراجہ کے ڈوگرے

نام اُس کا خان زمان ہے، لوگ اسے خانُو کہتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اُس کی عمر سو سال سے اُوپر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر نوّے اور سو سال کے درمیان ہے۔ اگر وہ سو سال سے اُوپر کا ہی ہے تو یہ کوئی عجوبہ نہیں۔ وہ کشمیر کے اُس علاقے کا رہنے والا ہے جہاں برف پڑتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کی عمریں عموماً لمبی ہوتی ہیں۔ خانو کسی شہر میں نہیں چھوٹے سے ایک گاؤں میں رہتا تھا جو بلندی پر واقع ہے۔ اس کی بیوی کو مرے چھ سات سال گزر گئے ہیں۔ اس کے چھ بیٹے ہیں جن میں سے چار زندہ ہیں۔ ان بیٹوں کے بھی بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور ان کے بھی بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے بعض انگلستان میں ہیں۔ وہ تین نسلوں کا بزرگ ہے۔ ان نسلوں کے افراد دُور دُور بکھر گئے ہیں، سمندر پار بھی چلے گئے ہیں لیکن خانو کو ان کی تعداد یاد ہے جو میں نے پوچھی تو اس نے ذہن پر زور دیئے بغیر کہا — "بیاسی"— اُسے یہ بھی یاد ہے کہ اُس کی کون سی نسل کا کون سا کنبہ کہاں ہے۔ اُسے ان سب کے ساتھ گہرا دلی لگاؤ ہے اور وہ سب اس کا احترام کرتے ہیں جس کا اظہار وہ لوگ خطوں میں کرتے رہتے ہیں۔

"یہی میری لمبی عمر کا راز ہے" — میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا — "پیار، ہر کسی سے، ہر انسان کے ساتھ محبت، خلوص۔ دل میں کدورت نہ رکھنا۔ آج کل میں نے دیکھا ہے کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے خاندان میں کدورت نہیں آنے دی۔ میری تیسری نسل کے بچے بھی میرے پاس اس طرح آتے ہیں جس طرح لوگ کسی پیر کے پاس جاتے

ون اردو ڈاٹ کام

ہیں۔"

"سادہ غذا اور کشمیر جیسی آب و ہوا ابھی تو عمر کو دراز کرتی ہے" — میں نے کہا۔

"میں نے کشمیر میں کئی لوگوں کو پچاس سال کی عمر میں بوڑھے ہو کر مرتے دیکھا ہے" — اُس نے کہا — "صرف وہ غذا عمر کو لمبا کرتی ہے جو تم دل کو دیتے ہو۔ اگر دل کو غصّہ اور کدورت کھلاتے رہو تو جسم اچھی غذا کے باوجود پچاس سال سے پہلے ہی اتنا بوڑھا ہو جائے گا جتنا میں سو سال میں بھی نہیں ہُوا۔ ۱۹۴۷ء میں جب، سمجھ لو، میری عمر ستر بہتر سال تھی میرا بڑھاپا شروع ہُوا تھا۔ ایک یہ غم دل کو لگ گیا ہے کہ میں وطن سے نکالا گیا اور میرے وطن پر کافروں کی بادشاہی ہے۔ دوسرا غم یہ ہے کہ لوگوں میں پیار اور خلوص نہیں رہا۔ یہ ملک مسلمانوں کا ہے مگر مسلمانوں کو گناہوں سے محبت ہو گئی ہے۔ میں پاکستانی جوانوں کے قدبُت اور ان کی صحت دیکھ کر اس سوچ میں غرق ہو جایا کرتا ہُوں کہ کشمیر کے لیے کون لڑے گا اور پاکستان پر بُرا وقت آن پڑا تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔"

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور کشمیری مسلمان ہندو سامراج سے کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے برسرِپیکار ہُوئے تو خان زمان بھی جہاد میں شریک ہو گیا لیکن اس کے بیٹوں نے اسے خاندان کے ساتھ مظفرآباد بھیج دیا اور خود جنگ لڑتے رہے۔ وہ مظفرآباد سے راولپنڈی اور وہاں سے جہلم چلا گیا۔ خان زمان کو بہت افسوس ہے کہ وہ جنگِ آزادی نہیں لڑ سکا۔

مَیں اُسے باتوں باتوں میں اُس دَور میں لے گیا جب وہ جوان ہُوا کرتا تھا۔ اس سے میرے ملنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کی جوانی جنگلوں اور پہاڑیوں میں گزری ہے۔ وہ انگریز شکاریوں کے ساتھ شکار پر بھی جاتا رہا ہے۔ میں اس سے اس کی جوانی کی کہانیاں سُننے گیا تھا اور جب میں اس سے دو تین واقعات سُن کر رخصت ہُوا تو میں سوچنے لگا کہ ہمارے مُلک میں انگریزی کی ان کہانیوں سے جن کے ہمیں رسالوں میں ترجمے پڑھائے جاتے ہیں، کہیں زیادہ سنسنی خیز اور دل چسپ کہانیاں موجُود ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ سچی وارداتیں ان لوگوں کے سینوں میں چھپی ہُوئی ہیں جن کے ہاتھ میں قلم نہیں اور جو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں۔

خان زمان کے سنائے ہوئے واقعات میں سے میں ایک واقعہ اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہُوں۔ کشمیر میں بب ڈوری ایک مقام ہے جس کے اِرد گرد علاقہ دشوار گزار اور پہاڑی ہے۔ خان زمان اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُس دور میں یعنی آج سے پچھتّر سال پہلے یہ علاقہ جنگلاتی تھا۔ وادیوں میں بعض جگہیں میدانی بھی تھیں۔ خان زمان سرینگر میں محنت مزدوری کرتا تھا۔

ہندوستان کے امیر کبیر لوگ اور انگریز گرمیاں سرینگر گزارا کرتے تھے۔ اس موسم میں روزگار بہت ملتا تھا۔ خان زمان کو وہاں مستقل ملازمت مل گئی۔ یہ کوئی ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس یا ایسی ہی کوئی جگہ تھی جہاں انگریز ٹھہرا کرتے تھے۔ ان میں بعض بڑے شکار کے لیے جاتے تھے اور بعض جنگل کی سیر کے شوقین تھے۔ وہ کشمیریوں کو قلیوں، راہنماؤں اور مددگار کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خان زمان شکار کو پسند کرتا تھا۔

اُس زمانے میں کشمیر کے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں بڑا شکار عام ہوتا تھا۔ اس میں لوہا شیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس شیر کو آپ ببر شیر یا دھاری دار شیر نہ سمجھیں۔ یہ شیر کی ہی نسل سے ہے۔ اس کا رنگ بادامی ہوتا ہے۔ اسے انگریزی میں جاگر کہتے ہیں۔ اس کا مُنہ دھاری دار شیر کی طرح ہوتا ہے۔ قدبُت اس سے کم ہے۔ خصلتیں اور درندگی شیروں والی ہیں۔ یہ درختوں پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ یہی اس کا خطرہ ہے۔ اکثر اوقات یہ کسی درخت سے شکار پر جھپٹتا ہے۔

اس نسل میں ایک اور درندہ بھی اُس دَور میں پایا جاتا تھا جسے سیاہ گوش کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرمئی بھی ہوتا ہے اور سرخی مائل زرد بھی۔ کان چونکہ سیاہی مائل ہوتے ہیں اس لیے اسے سیاہ گوش کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کشمیر میں چٹانی بلیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک توترہ ہے۔ اس کی جسامت عام بلّی سے دگنی اور درمیانہ قدبُت کے کُتّے جتنی ہوتی ہے۔

ب کشمیر میں ریچھ ناپید ہوگیا ہے۔ لوہا شیر خاص خاص علاقوں میں اب بھی نظر آتا ہے۔ سیاہ گوش بھی غائب ہوگیا ہے۔ چٹانی بلیوں کی ایک دو نسلیں ابھی باقی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ تک کشمیر کے ویران علاقوں میں یہ درندے موجود رہے۔ جنگ نے انہیں وہاں سے بھگا دیا۔ البتہ لوہا شیر تلاش کرنے سے مل جاتا ہے۔ مثلاً آزاد کشمیر میں تولی پیر نام کا وسیع جنگل ہے جو درہ حاجی پیر سے جا ملتا ہے۔ اس جنگل میں لوہا شیر مل جاتا ہے۔ یہ شیر چیتے سے زیادہ پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے۔ خونخوار بھی چیتے کی ہی طرح ہے۔ قدرت نے اسے بجلی کی سی جو پھرتی دی ہے وہ شکاریوں کو بُری طرح پریشان کرتی ہے۔

اُس وقت خان زمان کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ تین چار انگریز شکاریوں کے ساتھ لوہا شیر کے شکار پر جا چکا تھا۔ وہ سرینگر میں تھا۔ دو انگریز شکاری آئے۔ اُنہیں بھی بندوق بردار اور گائیڈ کی حیثیت سے خان زمان دیا گیا۔ وہ بہت ہوشیار اور ذہین تھا۔ ان کے ساتھ وہ سرینگر سے روانہ ہُوا۔ بارہ مولا میں رات کے لیے قیام کیا تو اسی روز وہاں اطلاع آئی تھی کہ لوہا شیروں کے ایک جوڑے نے ہیب ڈوری کے علاقے میں انسانوں کا جینا حرام کر دیا ہے اور وہاں کے دیہاتی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ انگریز شکاری بارہ مولا پہنچے تو کسی سرکاری افسر نے انہیں بتایا کہ وہ یہ اطلاع سرینگر اس درخواست کے ساتھ بھیج رہے تھے کہ اس جوڑے کو ختم کرنے کا انتظام کیا جائے۔

ان شکاریوں کو ڈوگرہ فوج کا ایک انگریز افسر ملا۔ اُس نے انہیں بتایا کہ اس خونخوار جوڑے نے سب سے پہلے اس کے دو ڈوگرے سپاہیوں کو کھایا ہے۔ اُس نے کہا کہ اسے مہاراجہ کی درخواست پر ڈوگرہ فوج کی ٹریننگ کے لیے برطانوی ہند کی فوج سے عارضی طور پر بھیجا گیا ہے۔ اس کے سپاہی جنگلوں میں اکیلے اکیلے بھی جایا کرتے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ شیروں کے جوڑے کو ختم کیا جائے۔

اطلاع کے مطابق اس جوڑے نے پہلے دو ڈوگرہ سپاہیوں کو کھایا۔ تین چار دنوں بعد دیہاتیوں کا ایک بچہ جس کی عمر دس گیارہ سال تھی لاپتہ ہو گیا۔

تلاش کے لیے نکلے تو ایک جگہ اس کا صرف سر ملا اور چند ایک ہڈیاں۔ پہلے یہ کہا گیا کہ یہ بھیڑیوں کی کارستانی ہے لیکن بچے کی موت کے تیسرے روز پتہ چل گیا کہ کون سا درندہ ہے۔ ایک آدمی ایک پہاڑی پر ایک درخت کاٹ رہا تھا۔ اس نے نیچے شیروں کی غراہٹ اور پھر کسی انسان کی چیخیں اور واویلا سنا۔ اُس نے نیچے دیکھا تو رگوں میں اس کا خون جم گیا۔ دو شیر ایک آدمی کو مار کر گھسیٹ رہے تھے۔ اُس نے پھر یہ نہیں دیکھا کہ شیر لاش کو کہاں لے گئے۔ وہ دوسری طرف سے پہاڑی سے اُترا اور خوف سے کانپتا ہُوا گاؤں پہنچا۔ گاؤں والے اتنے زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے کہ اُنہوں نے لاش کی تلاش کی بھی جرأت نہ کی۔ دوسرے دن ایک چٹان کے دامن میں لاش کی بچی ہُوئی کھوپڑی ایک ہاتھ اور کچھ ہڈیاں ملیں۔

تین روز بعد ایک جوان عورت رات کے پہلے پہر گھر سے نکلی۔ شیروں کی غراہٹ کے ساتھ عورت کی چیخیں سنائی دیں۔ گاؤں کے چند ایک ہی گھر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہ نکلا۔ عورت کا خاوند کلہاڑی لے کے باہر گیا۔ چاندنی میں اسے دو شیر نظر آئے جو اس کی بیوی کو ڈھلان سے اتار رہے تھے۔ اس نے بہت شور مچایا۔ اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہ نکلا۔

یہ دونوں انگریز شکاری دلیر ضرور تھے، تجربہ کار شکاری معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ جو ملازم تھے ان میں ایک تو خان زمان تھا اور دوسرا سوات کا رہنے والا ایک جوان آدمی۔ خان زمان کو اُس کا نام یاد نہیں رہا۔ تین چار قلی بھی تھے لیکن وہ غریب طبع اور سیدھے سادے آدمی تھے جنہیں شکار کے ساتھ صرف اتنی دلچسپی تھی کہ انہیں روزی کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔

انگریز شکاریوں نے کہا کہ شیروں کے اس جوڑے کو انسانی گوشت کا نشہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے تین تین دن کے وقفے سے انسان کھائے ہیں۔ ایک انسان ان دونوں کے لیے دو دن کافی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی شیر گاؤں کے قریب نہیں آئے تھے۔ انسانی گوشت کا نشہ انہیں گاؤں میں لے آیا تھا۔ شکاریوں نے کہا کہ انہیں جلدی نہ مارا گیا تو یہ دن کے وقت بھی گاؤں میں

Scanned b iqbalmt

آجایا کریں گے۔ خان زمان نے مجھے بتایا کہ شیر کسی بھی قسم کا ہو، ببر ہو، دھاری دار یا گلدار، وہ انسان کو صرف اسی صورت میں شکار کرتا ہے جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں وہ ہرن خرگوش اور اس قسم کے تیز دوڑنے والے شکار کے پیچھے بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے دانت اور پنجے بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس جسمانی حالت میں انسان آسان شکار ہوتا ہے۔ بعض شیر صرف عورت یا صرف بچے پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ یہ اور زیادہ آسان شکار ہے مگر جب ڈوری کے لوہا شیر دو تھے۔ یہ نر اور مادہ ہی ہو سکتے تھے۔ دو نر اکٹھے شکار نہیں کھیلا کرتے۔ یہ دونوں بوڑھے نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں انسانی گوشت اور خون کی ویسی ہی عادت ہو گئی تھی جیسے چرس اور شراب کی ہوتی ہے۔ انسانی خون درندے پر نشہ طاری کر دیتا ہے۔ لوہا شیر بھوکا نہ ہو تو کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا اور آبادیوں سے دور رہتا ہے۔ غالباً یہ دونوں فوجی ڈوگرے سے انہیں اس وقت مل گئے تھے جب شیر بھوکے تھے۔ کشمیر پر چونکہ ڈوگروں کا راج تھا اس لیے وہ ہٹے کٹے تھے۔ ان کا گوشت اور خون شیروں کو بہت ہی پسند آیا ہو گا۔

ڈوگرہ فوج کے اس انگریز افسر سے پوچھا گیا کہ سپاہیوں کو ساتھ لے جا کر وہ خود شیروں کو کیوں نہیں مارتا؟ اس نے بتایا کہ اسے شیر کے شکار کا کوئی تجربہ نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ فوجیوں کو استعمال نہیں کر سکتا کیوں کہ کوئی سپاہی مارا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی سپاہی گھبرا کر گولی چلا دے اور اپنے ہی کسی ساتھی کو مار ڈالے۔ وجہ معقول تھی۔ انگریز شکاری اسی وقت تیار ہو گئے۔ جب ڈوری کا علاقہ چونکہ خان زمان کا اپنا علاقہ تھا اس لیے کسی اور گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جب اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ وہ اس علاقے سے واقف ہے تو اسے بتایا گیا کہ جو عورت اور بچہ شیروں کا شکار ہوئے ہیں وہ اسی کے گاؤں کے تھے۔ خان زمان پریشان ہو گیا۔ ان دنوں دور دراز دیہات میں ڈاک کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے اسے اپنے گھر کے متعلق کچھ خبر نہیں تھی کہ گھر والے کس حال میں ہیں۔

سامان کے لیے تین خچریں ساتھ تھیں۔ سامان میں ایک خیمہ بھی تھا۔

شکاریوں کی سواریوں کے لیے دو گھوڑے تھے اور ملازم پیدل۔ انہیں راستے میں ایک جگہ پڑاؤ کرنا پڑا کیونکہ وہ بے وقت روانہ ہوئے تھے اور فاصلہ زیادہ تھا۔ کٹھن بھی تھا۔ اگلے روز منزل پہ پہنچے تو خان زمان انہیں اپنے گاؤں لے گیا۔ یہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر چند ایک جھونپڑے تھے۔ علاقہ سرسبز اور خوبصورت تھا۔ انگریز شکاریوں کے لیے ایک موزوں جگہ خیمہ گاڑ دیا گیا۔ گاؤں والوں پر خوف و ہراس غالب آیا ہوا تھا۔ کچھ دور ایک گاؤں تھا وہاں بھی یہی عالم تھا۔ یہ گاؤں میدانی علاقے کے دیہات کی طرح نہیں تھے۔ چند ایک جھونپڑے ایک جگہ تھے۔ دو تین ان سے کچھ دور یا اوپر تھے۔ کسی وادی میں دو اور جھونپڑے تھے۔ آبادی بہت ہی کم تھی۔ ذرائع آمد و رفت ناپید تھے اور یہ معصوم سے لوگ جنگل کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔ اگر دو فوجی شیروں کے پیٹ میں نہ چلے جاتے تو ان دیہاتیوں کا کسی کو کوئی غم نہ ہوتا۔ انہیں درندے کھا جاتے یا کسی اور آفت کا شکار ہو جاتے تو سرنگر میں عیش و عشرت میں بدمست مہاراجے کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

شیروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ وہ جگہیں دیکھی گئیں جہاں شیروں نے انسانوں پر حملے کیے تھے اور وہ جگہیں بھی دیکھی گئیں جہاں سے ان بدنصیبوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں ملی تھیں۔ شیروں کے پنجوں کے نشان ڈھونڈے گئے لیکن سبزہ زیادہ تھا۔ اس لیے یہ نشان کم ہی نظر آئے۔ انگریز شیروں کی کچھار ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ کچھار کے سامنے مورچہ باندھ لیا جائے اور وہ جوں ہی باہر آئیں انہیں نشانہ بنا لیا جائے، مگر کچھار کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ چھوٹی سی ایک ندی نے ایک جگہ جھیل بنا رکھی تھی۔ خیال تھا کہ شیر وہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔ وہاں ان کے پنجوں کے نشان ملے لیکن یہ نشان کوئی رہبری نہ کر سکے۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ یہ پہچان کیسے کی جائے گی کہ انسانوں کو کھانے والا جوڑا کون سا ہے۔

تلاش سے ناکام ہو کر وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو شیر کے شکار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ تھی مچان جو کسی درخت پر بنائی جاتی ہے مگر اس علاقے میں

چیل اور دیودار کے درخت تھے جن کا تنا سیدھا اور اس کی ٹہنیاں بہت اُونچی ہوتی ہیں۔ یہ درخت مچان کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ وہاں جو دوسری اقسام کے موزوں درخت تھے وہ موزوں جگہوں پر نہیں تھے۔ ایک جگہ چیل کے تین درخت دیکھے گئے جو ایک دوسرے کے بہت قریب قریب تھے۔ گاؤں والوں سے کہہ کر تین چار درخت کٹوائے گئے۔ ان کے تنوں اور ٹہنوں کو ان تین درختوں کے تنوں کے ساتھ باندھا گیا۔ یہ درخت مثلث بناتے تھے۔ ان کے ساتھ باندھی ہوئی لکڑیوں کی اچھی خاصی مچان بن گئی۔ اس سے پندرہ بیس گز دُور دو درخت ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ان کے ساتھ بھی کٹے ہوئے تنے باندھ کر دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لی گئی۔ یہ مچانیں خان زمان کے لیے عجیب اور دلچسپ تھیں۔ اُس وقت تک وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ شیر کو آمنے سامنے آ کر گولی سے مارا جاتا ہے اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس علاقے کے دو آدمیوں نے دو شیر برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مارے تھے۔

شام سے کچھ دیر پہلے مچانوں کے سامنے ایک بکری کا میمنا باندھ دیا گیا۔ بڑی مچان پر ایک انگریز شکاری کے ساتھ خان زمان ٹارچ لے کر بیٹھا اور چھوٹی مچان پہ دوسرا انگریز بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ سواتی تھا۔ اس کے پاس بھی ٹارچ تھی۔ انگریزوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ کوئی آواز پیدا نہ کریں اور اشارے پر ٹارچ کی روشنی وہاں ڈالیں جہاں میمنا بندھا ہُوا ہے۔

شکاریوں کے پاس بارہ بور کی شکاری دونالی بندوقیں تھیں۔ ان میں انہوں نے بڑے جانور کو مارنے والے کارتوس بھر لیے اور رات گزرنے لگی۔ گیدڑوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ ان آوازوں میں بھیڑیوں کی آوازیں بھی تھیں۔ خطرہ یہ تھا کہ بھیڑیے میمنے پر آ گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ بہت دیر بعد میمنا جو آہستہ آہستہ ممیا رہا تھا بڑی زور سے بولا اور اس کے کودنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہلکی ہلکی غراہٹ بھی سنائی دی۔ شکاریوں کے اشاروں پر خان زمان اور سواتی نے ٹارچیں جلا دیں۔ تین بھیڑیے میمنے کی طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے جسموں کو حملے کی پوزیشن میں کر رکھا تھا۔ شکاریوں نے شور مچایا۔ خان زمان اور سواتی نے بھی طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ بھیڑیے رُک گئے مگر وہ میمنے جیسی من بھاتی غذا سے اتنی جلدی دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں ڈرانے کے لیے کوئی گولی نہیں چلائی جا سکتی تھی کیونکہ خطرہ تھا کہ مطلوبہ شیر کہیں قریب ہُوئے تو بھاگ جائیں گے۔

شکاریوں کے کہنے پر ٹارچیں بجھا دی گئیں کیونکہ سیل ختم ہونے کا ڈر تھا۔ چاروں نے شور شرابہ جاری رکھا۔ بھیڑیوں کی ہلکی غراہٹ میں ایک گونجدار اور سخت غصیلی غراہٹ سنائی دی۔ ٹارچیں پھر جل اٹھیں۔ بھیڑیے بھاگ گئے۔ وہ انسانوں کے شور سے نہیں بھاگے تھے۔ وہ اپنے سے زیادہ خونخوار اور طاقتور درندے کے ڈر سے بھاگے تھے۔ یہ شیر ہی ہو سکتا تھا۔ بھیڑیے گھوم کر دوسری طرف سے آئے اور میمنے سے تھوڑی دُور رُک گئے۔ اچانک اندھیرے سے ایک شیر نے جست لگائی اور ایک بھیڑیے کے اُوپر جا پڑا۔ دوسرے بھیڑیے غائب ہو گئے اور وہ جو شیر کی گرفت میں آ گیا تھا جانے کس طرح اس کے پنجے سے نکل گیا۔ اس کے فوراً بعد دوسرا شیر گولی کی طرح آیا اور سب درندے ٹارچ کی روشنی سے نکل گئے۔ یہ سارا ڈرامہ دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ شکاریوں کو شیروں کا نشانہ لینے کی مہلت نہ ملی۔ ٹارچیں بجھا دی گئیں۔ تین بھیڑیوں اور دو شیروں کے درمیان بکری کے ذرا سے میمنے پر جو گزر رہی تھی وہ اس کی اچھل کود اور عجیب و غریب آوازوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ چھوٹے سے بچے سے رسی ٹوٹتی نہیں تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دبے دبے قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی دینے لگی۔ میمنا اور زیادہ چیخ و پکار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہلکی ہلکی غراہٹ بھی سنائی دی۔ اس میں غصہ اور تلخی نہیں تھی۔ شکاریوں کے اشارے پر خان زمان اور سواتی نے ٹارچیں جلا دیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے نظر آیا کہ دونوں شیر اس طرح کھڑے تھے کہ میمنا ان کے درمیان کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز شاید خوف کی انتہا سے بند ہو گئی تھی۔ خان زمان کے ساتھ والے شکاری نے شست باندھی۔ ایک شیر نے میمنے کے منہ کے ساتھ منہ لگا کر سونگھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ابھی کوئی گولی نہیں چلی تھی کہ سواتی کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور نیچے جا پڑی۔ دوسرے شکاری نے عین اسی وقت گولی چلائی لیکن شیر بدک کر اس طرح غائب ہو چکے تھے جیسے آنکھ جھپکی جاتی ہے۔ ان کی پھُرتی کی یہ انتہا جیسے وہ کھڑے کھڑے جادو کے زور سے غائب ہو گئے ہوں۔ اس سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ شیروں نے میمنے کو صرف ایک بار سُونگھا تھا اُسے پکڑا اور مارا نہیں تھا۔ شیر بکری یا اپنے کسی بھی شکار کو سونگھا نہیں کرتا اور نہ سوچا کرتا ہے۔ یہ دونوں شیر میمنے کے پاس کھڑے رہے جیسے اس کے ساتھ انہیں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اگر سواتی کے ہاتھ سے ٹارچ نہ گرتی تو شیروں کو مار لیا جاتا۔ دونوں شکاریوں نے اسے بہت ڈانٹا اور اسے یہ سزا دی کہ اسی وقت اسے نیچے اترنے اور ٹارچ اٹھا لانے کا حکم دیا گیا۔ نیچے خطرہ تھا کہ شیر کہیں قریب ہی نہ ہوں۔ خان زمان نے اسے ٹارچ کی روشنی دی اور وہ ٹارچ اُٹھا کر اُوپر چلا گیا۔ رات بھر انتظار کرتے رہے ہ شیر نہ آئے اور بھیڑیئے بھی نہ آئے۔ ایک جنگلی بلّی آئی جو میمنے کو تھوڑی دیر پریشان کر کے چلی گئی۔

صبح طلوع ہوئی تو سب واپس آ گئے۔ گاؤں والوں نے رات ایک گولی کی آواز سُنی تھی۔ وہ خوش تھے کہ ایک شیر مار لیا گیا ہے۔ مگر وہ بہت مایوس ہُوئے۔ انہیں جب یہ بتایا گیا کہ شیروں نے میمنے کو چھیڑا تک نہیں تو وہ حیران نہیں ہُوئے بلکہ ڈر گئے۔ یہ معجزہ تھا کہ شیروں نے بکری کے بچے کو نہ کھایا۔ گاؤں کے دو بوڑھوں نے پُورے یقین کے ساتھ کہا کہ یہ شیر نہیں ہیں یہ مرے ہُوئے کافروں کی بدرُوحیں ہیں جو مسلمانوں کو کھا رہی ہیں۔ گاؤں والوں نے فوراً تسلیم کر لیا اور وہ سوچنے لگے کہ بدروحوں کو بھگانے کے لیے کسے بلائیں۔ بعض نے نذر نیاز دینے کا اعلان کر دیا اور کسی نے پُونچھ کے کسی بزرگ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔

انگریز شکاریوں نے یہ معمّہ حل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ شیر انسانی گوشت اور خون کے اتنے زیادہ نشئی ہو چکے ہیں کہ اب انہیں بکری کا گوشت اچھا نہیں لگتا۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں مچانوں پر بیٹھے ہوئے انسانوں کی بُو آ رہی تھی۔ ایک شیر نے میمنے کو سُونگھ کر یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ یہ بُو اس کی تو نہیں۔ اگر وہاں انسانوں کی بُو نہ ہوتی تو وہ بکری کے بچے کو کھا لیتے۔ ایک انگریز شکاری نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ نو ہا شیر درخت پر چڑھ سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں کسی ایک مچان پر چڑھ آئیں۔

وہ دن شکاریوں نے سو کر گزار دیا۔ شام سے ذرا پہلے بکری کے بچے کی جگہ گائے کا ایک چھوٹا سا بچھڑا لیا گیا۔ اسے مچانوں کی جگہ لے گئے اور اس جگہ باندھ دیا جہاں گزشتہ رات بکری کا بچہ باندھا گیا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ بہت دیر بعد قریب کہیں بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ بچھڑے کے قریب نہ آئے۔ اس کے بعد انہیں سامنے دو چمکتی آنکھیں دکھائی دیں۔ فوراً ہی یہ آنکھیں چار ہو گئیں۔ یہ شیروں کا جوڑا تھا۔ آنکھیں غائب ہو گئیں۔ پھر یہ ایک اور جگہ نظر آئیں۔ بچھڑا تڑپنے اور بولنے لگا۔ اسے اپنے قریب شیروں کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ ابھی ٹارچیں نہ جلائی گئیں۔ شیر ابھی دُور تھے مگر وہ بچھڑے کے پاس آتے نظر نہیں آتے تھے۔ آنکھیں غائب ہو گئی تھیں۔

خان زمان نے اپنی مچان کے نیچے آہٹ سنی۔ اس کے شکاری نے اُسے نیچے روشنی ڈالنے کو کہا۔ اس نے مچان کے بالکل نیچے روشنی ڈالی اور جھک کر دیکھا تو اسے ایک شیر نظر آیا جو ایک درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا اُوپر دیکھ رہا تھا۔ دوسرا نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ شیر جانوروں میں نہیں انسانوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسری مچان کے شکاری نے اس گھبراہٹ سے گولی چلا دی کہ شیر اُوپر چڑھنے لگے ہیں۔ صبح دیکھا کہ گولی درخت کے تنے میں لگی تھی۔

اس گولی کے بعد نہ کوئی شیر نظر آیا نہ ان کی آنکھیں۔ رات جاگتے اور اونگھتے گزر گئی۔ صبح بچھڑے کو صحیح و سلامت واپس لے گئے۔ گاؤں کے لوگوں کو پتہ چلا کہ شیر آئے تھے اور انہوں نے بچھڑے کو بھی نہیں کھایا تو وہ اور زیادہ ڈر گئے۔ بزرگوں نے تصدیق کر دی کہ یہ شیر نہیں بدروحیں ہیں۔ فوراً ہی ایک روایت مشہور ہو گئی کہ کچھ عرصہ گزرا ایک ہندو اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جا رہا

تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے انہیں روک لیا۔ وہ انہیں لُوٹ کر بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن ہندو نے مقابلہ کیا جس میں دونوں میاں بیوی مارے گئے۔ اب یہ دونوں اپنے خون کا انتقام لیتے پھر رہے ہیں۔

انگریز شکاریوں نے یہ رائے دی کہ تین دن گزر گئے ہیں شیروں نے کوئی انسان نہیں کھایا۔ اب وہ اتنے بھُوکے ہوں گے کہ کسی بھی جانور کو کھا لیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ آج رات بڑی بکری باندھی جائے گی۔ اگر شیروں نے بکری بھی نہ کھائی تو کوئی اور ترکیب سوچی جائے گی۔ گاؤں والوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ باہر نہ جائیں۔ ایک آدمی نے مچانوں کے قریب باندھنے کے لیے اپنی بکری پیش کر دی۔ اُسی سے کہا گیا کہ وہ شام سے پہلے بکری مچانوں کی جگہ پہنچا دے۔ دونوں انگریز کھا کر سو گئے۔ خان زمان اور سواتی بھی گہری نیند سو گئے، وہ سب دوپہر کے کھانے کے لیے جاگے۔ کھانا کھا کر وہ شام کا انتظار کر رہے تھے۔ خان زمان اور سواتی انگریزوں کے ملازموں کے ساتھ خیمے کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گاؤں کے دو آدمی سخت گھبراہٹ کی حالت میں دوڑتے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ شیر ایک آدمی کو مار کر لے گئے ہیں۔

معلوم ہُوا کہ یہ وہی آدمی تھا جس نے اپنی بکری پیش کی تھی۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے بکری مچانوں تک لے جائے۔ وہ نوجوان تھا اور سیدھا سادا بھی۔ اس کے ساتھ دو دوست تھے۔ وہ دوپہر کو ہی بکری لے کے چل پڑے۔ مرنے والے کے دوستوں نے بتایا کہ وہ مچانوں پر چڑھنا چاہتے تھے۔ بہرحال موت اس نوجوان کو لے گئی۔ راستے میں وہ بکری کو پکڑے ہُوئے آگے آگے جا رہا تھا اور اس کے دوست پیچھے رہ گئے۔ ان میں سے ایک نے شیر کو دیکھ لیا تھا۔ شیر حملے کی پوزیشن میں تھا۔ اس آدمی نے بکری والے کو آواز دی مگر شیر نے جست لگا دی اور اسے دبوچ لیا۔ دوسرا شیر بھی سامنے آگیا۔ بکری والا ختم ہو گیا اور اس کے دوست بھاگ آئے۔

ذرا سے وقت میں گاؤں کے لوگ انگریز شکاریوں کے خیمے کے گرد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کی ماں، اس کے باپ اور دو بہنوں کے بَین اور دھاڑیں

برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ اس بدنصیب کا ایک بڑا بھائی تھا، اس نے کہا — ”اگر تم دو بندوقوں کے ہوتے ہوئے بھی شیروں کو نہیں مار سکتے تو میں اکیلا اس کلہاڑی سے شیروں کو ماروں گا۔“

ایک اور آدمی نے کہا — ”میرے پاس برچھی ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔“

یہ دونوں آدمی خالی جوش میں آ کر بڑ نہیں مار رہے تھے۔ انہوں نے شیروں کو مارنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ خان زمان بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور اسے دیکھ کر سواتی نے بھی ان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ ان دونوں نے انگریز شکاریوں سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو چلیں لیکن شیر سامنے آئیں تو وہ گولی نہ چلائیں۔ تماشہ دیکھتے رہیں۔ اگر وہ دیکھیں کہ ان میں سے کسی کی جان خطرے میں ہے تو گولی چلائیں۔ انگریزوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ چونکہ ابھی آدھا دن باقی ہے اس لیے ابھی سے شیروں کا تعاقب کریں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ انہیں یہی ڈر تھا کہ شیر ایک آدھ دن میں کسی انسان پر حملہ کریں گے۔

یہ پارٹی چل پڑی۔ اس میں دو انگریز شکاری تھے جن کے پاس ایک ایک دونالی بندوق اور کارتوس تھے۔ خان زمان تھا جس کے پاس برچھی تھی۔ سواتی کے پاس ڈیڑھ فٹ لمبی تلوار تھی۔ باقی دو آدمیوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ یہ دو آدمی سخت غصے میں تھے۔ مرنے والے کا ایک دوست وہ جگہ دکھانے کے لیے ساتھ ہو لیا جہاں شیروں نے اس آدمی پر حملہ کیا تھا۔ روانہ ہوتے وقت خان زمان نے گاؤں والوں سے کہا — ”اگر آج شیر نہ مرے تو ہم میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا۔ دُعا کرو کہ اللہ ہمیں کامیاب کرے“ — عورتوں نے بلند آواز سے انہیں دعائیں دیں۔ اور یہ لوگ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جس جگہ شیروں نے حملہ کیا تھا وہاں خُون تھا۔ مرنے والے کے دوست کو وہاں سے واپس چلے جانے کو کہا گیا مگر وہ جوش میں آگیا۔ اس نے کہا — ”میں اپنے دوست کے خون کا بدلہ لوں گا“ — وہاں تک چند اور آدمی بھی آگئے

تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی جس کا دستہ چھوٹا تھا۔ اُس نے اس آدمی سے کلہاڑی لے لی اور شکاری پارٹی کے ساتھ چل پڑا۔ لاش کو گھسیٹنے کے نشان اور خون کے دھبے پوری طرح نمایاں تھے۔ یہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر چلتے گئے۔ شیر کی خصلت ہے کہ وہ شکار کو جہاں مارتا ہے وہیں نہیں کھاتا۔ کہیں اور لے جا کر عموماً اپنی کچھار میں رکھ دیتا ہے اور دیر بعد کھانا شروع کرتا ہے۔ پورے اطمینان سے کھاتا ہے۔ بعض اوقات شیر شکار کو پوری رات رکھے رکھتا ہے اور اگلے روز کھاتا ہے .... پہاڑیوں اور چٹانوں کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتے اور موڑ مڑتے ندی تک پہنچ گئے۔ اس کے کنارے ایک جگہ بہت سا خون تھا۔ یہاں شاید شیروں نے لاش کو چھوڑ کر پانی پیا ہوگا۔ آگے خون کم ہوتا جا رہا تھا۔ گھاس پر گھسیٹنے کے نشان تھے۔

بہت آگے جا کر ندی الگ ہٹ گئی اور وہ ایک وادی میں داخل ہو گئے۔ وادی کھلتی گئی اور آگے خاصی کشادہ ہو گئی۔ کسی نے کہا — "وہ دیکھو، اُوپر" — اُوپر دیکھا تو ایک درخت کے ٹہن پر لاش پڑی تھی۔ شیروں نے لاش کو پیٹ کے بل ٹہن پر رکھا تھا۔ اُس کا اُوپر کا دھڑ ایک طرف اور نیچے کا دوسری طرف لٹک رہا تھا۔ وہ جگہ اس طرح تھی کہ وہ ایک پہاڑی تھی۔ ذرا اُوپر جا کر اس کا کچھ حصہ دیوار کی طرح ہو گیا تھا۔ ڈھلان پر بڑ کی قسم کا درخت تھا جس کے ٹہن پہاڑی کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اِس دیوار کے اُوپر اور ذرا پیچھے ہٹ کر گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے اور وہیں سے پہاڑی سیدھی اُوپر اٹھتی تھی۔ یہ جگہ ایسی تھی جو شیروں کی کچھار کے لیے موزوں تھی۔ ایک طرف سے ڈھلان پر چڑھا جا سکتا تھا جہاں لاش رکھی ہوئی تھی اس کے نیچے تھوڑی سی جگہ ہموار تھی وہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی جس کی بلندی دس بارہ گز ہو گی۔ شیروں نے لاش نہایت محفوظ جگہ رکھی تھی۔

انگریز شکاری بندوقوں کے گھوڑے چڑھا کر ذرا اونچی جگہوں پر ایک دوسرے سے دُور دُور بیٹھ گئے اور ہر طرف دیکھنے لگے تاکہ شیر کسی بھی طرف سے آ جائیں تو انہیں نشانہ بنا لیں۔ سواتی نے انہیں کہا کہ وہ پہلے انہیں موقع دیں کہ وہ اپنے

ہاتھوں شیروں کو مار سکیں۔ انہوں نے مل کر شور مچایا۔ شیر باہر نہ آئے۔ انہوں نے اُوپر پتھر پھینکے۔ شیر پھر بھی باہر نہ آئے۔ انگریزوں نے کہا کہ شیر باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہاں ہوتے تو باہر آ جاتے۔ انگریز اور زیادہ چوکس ہو گئے۔ انہیں توقع تھی کہ کسی بھی لمحے شیر کہیں سے آ جائیں گے۔ یہ آدمی اُوپر نہیں گئے کیونکہ جہاں کچھار کا امکان تھا وہاں لڑنے کے لیے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ پانچ آدمیوں کے لیے وہ جگہ ناکافی تھی۔ وہ شیروں کو نیچے کھلی جگہ لانا چاہتے تھے، مگر شیر تھے کہاں؟ وہاں تو خاموشی تھی اور وہاں ایک لاش پڑی تھی۔

جس کی لاش تھی اُس کے بھائی سے رہا نہ گیا۔ وہ دوڑ کر اُوپر اُس جگہ گیا جو لاش والے ٹہن کے نیچے تھی۔ درخت عجیب سا تھا اور بڑی عجیب جگہ تھی۔ اس کی ایک جڑ پہاڑی کے عمودی حصے کے ساتھ ساتھ باہر کو نیچے تک آ گئی تھی

اس آدمی نے جڑ کو پکڑا اور تھوڑا اُوپر گیا تو اس کا ہاتھ لاش کی لٹکتی ٹانگوں تک پہنچ گیا۔ اُس نے ٹخنہ پکڑا اور نیچے کو جھٹکے دینے لگا۔ لاش آہستہ آہستہ سرکی اور نیچے آ پڑی۔ بھائی نے نیچے آ کر لاش کو کندھوں پر اُٹھایا۔ دوسرے آدمی اُس کی مدد کو اُوپر جانے ہی لگے تھے کہ سواتی نے چلا کر کہا — "پیچھے ہٹ جاؤ کلہاڑی اُٹھا لو" — اس کی پکار کے ساتھ ہی شیر اتنی زور سے غرایا کہ سب ڈر گئے۔ اُوپر دو شیر کھڑے نظر آئے جو ٹانگیں سکیڑ کر حملے کے لیے تیار تھے اور سخت غصے میں غرا رہے تھے۔ مگر وہ نظر آئے اور دوسرے لمحے ان میں سے ایک تیر کی طرح نیچے آیا۔ اُس کے پیچھے دوسرا آیا۔ پہلا شیر اُس آدمی کے اُوپر گرا جس نے لاش اتاری تھی۔ وہ لاش کندھوں پر ڈال چکا تھا۔ شیر چونکہ اُوپر سے بہت تیزی سے آیا تھا اس لیے وہ لاش اور اس کے بھائی کے ساتھ ہی اُس تھوڑی سی ہموار جگہ سے ڈھلان پر آیا اور یہ سب لڑھکتے ہوئے نیچے آ گئے جہاں یہ پارٹی شیروں کو لانا چاہتی تھی۔

دوسرا شیر بھی بجلی کی تیزی سے آیا۔ انگریزوں نے غالباً شیروں اور انسانوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے گولی نہ چلائی، یا انہیں نشانہ لینے کا موقعہ ہی نہیں ملا ہوگا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ لوہا شیر حیران کُن حد تک پھرتیلا ہوتا ہے۔ یہ

Scanned b qbalmt

کچھ سوچنے اور بچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا کرتا۔ لاش کے بھائی کو لاش نے بچالیا کیونکہ یہ اُس کے کندھوں پر تھی۔ شیر نے پنجے اسی میں گاڑھے تھے مگر بھائی کی کلہاڑی اُوپر ہی رہ گئی تھی۔ اُس کے چاروں ساتھی فوراً اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ڈھلان ختم ہوتی تھی۔ آگے آگے خان زمان تھا۔ اُس نے اس ارادے سے برچھی تانی کہ شیر کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں دے گا لیکن اُس کی ایک ٹانگ کی پنڈلی دانتوں کے شکنجے میں آگئی۔ یہ دوسرا شیر تھا جس نے اُس کی پنڈلی منہ میں لے لی تھی۔ شیر عموماً اگلی ٹانگیں اُٹھا کر حملہ کرتا اور گردن منہ میں لیا کرتا ہے لیکن اس شیر نے معلوم نہیں کیوں کتوں کی طرح نیچے سے حملہ کیا تھا۔ خان زمان گرا اور بہت تیزی سے گھوما۔ شیر نے اس کی پنڈلی کا پٹھا کاٹ ڈالا اور پنڈلی کاٹ کر دوسرے حملے کے لیے پیچھے ہٹا۔ خان زمان برچھی سنبھال کر اُٹھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کلہاڑی والا ایک آدمی قریب تھا اور شیر کے پیچھے۔ اُس نے شیر کو حملے کی مہلت نہ دی اور پوری طاقت سے اُس کی کمر پہ کلہاڑی کا وار کیا۔ شیر تیزی سے پیچھے کو مڑا تو خان زمان نے جست لگا کر اُسے برچھی ماری جو اس کے پہلو میں اُتر گئی۔ دوسرے آدمی کی کلہاڑی کا دوسرا وار بھی شیر کی کمر میں اترا۔ ریڑھ کی ہڈی کٹ جانے سے وہ ایک ہی جگہ گھومنے لگا۔ کلہاڑی اور خان زمان کی برچھی نے اُسے زیادہ دیر گھومنے نہ دیا۔ وہ گرا تو کلہاڑی اس کے سر پہ پڑی اور برچھی پسلیوں میں اُتر گئی۔

خان زمان کو ایک پھر دوسری گولی کے دھماکے سنائی دیئے۔ اُدھر دیکھا تو وہاں دو آدمی تڑپ رہے تھے۔ ہُوا یوں تھا کہ دوسرے شیر نے لاش کے بھائی کی گردن پیچھے سے منہ میں لے لی تھی۔ سواتی نے تلوار کا وار کیا مگر شیر اُس آدمی کو بھنبھوڑ رہا تھا اور اسے اپنے ساتھ گھما رہا تھا اس لیے تلوار کا وار اس آدمی کے بازو پر پڑا جس کی گردن شیر کے منہ میں تھی۔ اُس نے دوسرا وار شیر پر کیا تو شیر نے اُس آدمی کو چھوڑ کر سواتی پر جست لگائی۔ تلوار کا وار خالی گیا تھا۔ شیر بجلی کی طرح اُس پر آیا تھا۔ سواتی نے نوک کی طرف سے تلوار شیر کے سینے میں گھونپی۔ سینہ سامنے تھا کیونکہ شیر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ تلوار پوری طرح نہیں لگی۔ شیر نے سواتی کا منہ اپنے منہ میں لے لیا۔ اُسی وقت ایک انگریز نے جو قریب آگیا تھا شیر کے پہلو میں یکے بعد دیگرے دونوں نالیوں کے کارتوس فائر کر دیئے۔ شیر اتنی جلدی مرا نہیں کرتے لیکن یہ گولیاں دل کو کاٹ گئی تھیں اس لیے شیر گر پڑا اور ذرا سا تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

دونوں شیر مار لیے گئے مگر یہ پارٹی گاؤں میں پہنچی تو ساتھ دو لاشیں تھیں۔ ایک وہ جسے شیروں نے مارا تھا اور دوسری لاش اُس کے بھائی کی تھی۔ شیر نے پیچھے سے اُس کی گردن کو منہ میں لے کر بھنبھوڑا تھا۔ اس سے گردن کٹ گئی اور ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ زندہ نہ رہ سکا۔ شیر نے سواتی کا منہ اپنے منہ میں لے لیا تھا لیکن انگریز نے بروقت گولیاں چلا کر اُسے چھڑا لیا تھا۔ اُس کے منہ پر زخم آئے تھے لیکن مہلک نہیں تھے۔ خان زمان کی پنڈلی کا پٹھا باہر آگیا تھا۔ یہ نشان اُس کی جوانی کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے اور اتنا بھدا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔ پٹھا الگ ہو کر جسم کا بے جان حصہ بنا ہوا ہے اور پنڈلی میں گہرا گڑھا سا ہے۔ انگریز شکاریوں کے پاس فسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ اُنہوں نے خان زمان اور سواتی کی مرہم پٹی کر دی۔ گاؤں والوں کے پاس بھی کوئی دیسی ٹوٹکے تھے۔ انگریزی اور دیسی دوائیوں نے مل کر خون روک دیا۔

دونوں شیروں کو گاؤں والے اُٹھا لائے۔ ان میں ایک نر اور دوسری مادہ تھی۔ اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ دانت اور پنجے مضبوط تھے۔ انگریز سمجھ نہ سکے کہ یہ انسانی گوشت کے عادی کس طرح بن گئے تھے۔ خان زمان کو اپنے گھر والوں نے راز کی یہ بات بتائی اور کہا کہ کسی سے ذکر نہ کرے ورنہ سارے گاؤں کو سزائے موت مل جائے گی۔ اُس نے یہ راز پہلی بار میرے آگے فاش کیا۔ اب اسے اور اُس کے گاؤں والوں کو کوئی سزائے موت نہیں دے سکتا۔

راز یہ تھا کہ دو فوجی ڈوگرے ایک روز اُس کے گاؤں کے قریب سے گزرے۔ یہ اُسی فوج کے تھے جنہیں انگریز افسر اِس علاقے میں ٹریننگ کے لیے لایا تھا۔ اُن کا کیمپ گاؤں سے دُور تھا۔ یہ دونوں معلوم نہیں کیوں گاؤں کے قریب سے گزرے۔ وہاں دو تین عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ اِن میں ایک جوان لڑکی تھی۔ ڈوگروں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ اُس دور میں

مسلمانوں کی وہاں حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ اُن سے بیگار کبھی لی جاتی تھی اور اُن کی مستورات کی عزت ڈوگروں کے رحم وکرم پر تھی۔ ذرا سی بات پر مسلمان کو قید یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ڈوگروں کا راج تھا، اور یہ راج مُسلم کُش تھا۔

ان دو ڈوگروں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دوسری عورتیں بھاگ گئیں۔ گاؤں کے تین چار آدمی جن میں لڑکی کا باپ اور جوان بھائی بھی تھا دوڑے گئے۔ اُنہوں نے ڈوگروں کی منت سماجت کی لیکن وہ وحشی بنے ہوئے تھے۔ باپ دونوں ڈوگروں کو الگ لے گیا۔ دوسروں نے دیکھا کہ ڈوگروں نے اُسے پیسے دیئے اور اس کے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ اُس نے اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے لیا۔ دوسرے آدمیوں نے آپس میں کھُسر پھُسر کی اور کہا کہ یہ باپ بے غیرت ہے جو ڈوگروں سے پیسے لے کر اپنی بیٹی کی عزت انہیں دے رہا ہے۔ مسلمان مجبور بھی تھے۔ یہ باپ ڈوگروں کو اپنے گھر لے گیا۔ اُس کا جوان بیٹا بھی گھر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد باپ بیٹا باہر آئے۔ انہوں نے گاؤں کے مردوں کو پکارا۔ باپ بیٹے کے کپڑے خون سے لال تھے۔ باپ نے سب کو بتایا کہ وہ ان دونوں ڈوگروں کو اپنی بیٹی کی عزت کا سودا کر کے دھوکے سے گھر لے آیا تھا۔ اندر لے جا کر اُس نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ اُس کا ارادہ کیا ہے۔ اُس نے ڈوگروں کی رائفلیں رکھوا کر بٹھایا اور باپ بیٹے نے پیچھے سے اُن پر کلہاڑیوں سے حملہ کر دیا اور دونوں کو ختم کر دیا۔

یہ گاؤں چند ایک جھونپڑوں کا تھا۔ سب گھر مسلمانوں کے تھے۔ وہ مجبور تھے بے غیرت نہیں تھے۔ وہ لڑکی کے باپ کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ باپ بیٹے کے کپڑے بدلوا کر دھلوا دیئے گئے۔ ڈوگروں کی لاشیں اور رائفلیں چھپا دی گئیں۔ خون کا نشان بھی نہ رہنے دیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ دونوں لاشیں رات کو کہیں دبا دی جائیں گی۔ وہ دن بھر ڈرتے رہے کہ ڈوگروں کی تلاش میں کوئی اِدھر آنکلا تو گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔ شام کے بعد تک کوئی نہ آیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لاشیں اور رائفلیں اُٹھا کر لوگ چل پڑے اور ایک پہاڑی کی ڈھلان پر گڑھا کھود کر لاشیں اور رائفلیں اس میں رکھ دیں اور مٹی ڈال دی۔ جو مٹی بچی وہ اِدھر اُدھر پھینک دی۔ گڑھا غالباً گہرا نہیں کھودا گیا تھا۔

دوسرے دن گڈریوں نے بتایا کہ دو ڈوگرے فوجیوں کو شیروں نے کھا لیا ہے۔ گاؤں والے بہت حیران ہوئے۔ وہ پہلے اُس جگہ گئے جہاں انہوں نے دو لاشیں دبائی تھیں۔ وہاں رائفلیں پڑی تھیں لاشیں نہیں تھیں۔ ایک بوڑھے نے کہا کہ رات کو شیروں یا بھیڑیوں نے لاشیں نکال لی ہوں گی مگر لاشوں کے بچے کھچے حصے بہت دُور سے ملے تھے۔ لہٰذا یہ شیر ہو سکتے تھے بھیڑیئے لاش کو گھسیٹ کر نہیں لے جاتے۔ جہاں ملے وہیں کھا لیتے ہیں۔ اس بوڑھے کی تجویز پر دونوں رائفلیں گڑھے سے نکال کر کہیں دُور پھینک دی گئیں اور گڑھا مٹی سے بھر دیا گیا۔ فوج کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان ڈوگروں کو قتل کیا گیا تھا۔ انہیں شیروں کا شکار سمجھا گیا۔ یہ پہلے دو انسان تھے جو شیروں نے کھائے۔ انہی کے گوشت نے انہیں انسان کے گوشت کا عادی اور نشئی بنایا تھا۔

* * *

مراکش کا مجاہد

یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کا ہے جب مراکش غلام تھا۔ ایک کا نہیں دو ملکوں کا غلام۔ ایک حصے پر ہسپانوی قابض تھے، دوسرے پر فرانسیسی۔ زیادہ تر حصہ فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا۔

۱۹۲۲ء کے اوائل کے دن تھے۔ ہسپانوی مراکش میں کسی جگہ ہسپانوی فوج کا ایک مستقل کیمپ تھا جہاں ایک ہزار کے قریب فوج مقیم تھی۔ ہسپانوی جنرل سلوسٹر اس کیمپ کے دورے کے لئے گیا۔ وہاں ہر کوئی چاق و چوبند تھا۔ ہر فوجی اور ہر چیز جرنیل کے معائنے کے لئے تیار تھی۔ جنرل سلوسٹر کیمپ کا معائنہ کر رہا تھا کہ اچانک کیمپ میں ہڑبونگ مچ گئی جو قیامت کی صورت اختیار کر گئی۔ کیمپ میں جنگ شروع ہو گئی تھی۔ حملہ آور مراکش کے مجاہد تھے جن کی تعداد ہسپانوی فوج کا بمشکل دسواں حصہ تھی۔ مجاہدین کے پاس لاٹھیاں، تلواریں، برچھیاں اور خنجر تھے۔ انہوں نے اس فوج پر حملہ کیا تھا جس کے پاس رائفلیں، مشین گنیں، دستی بم، پستول اور توپیں تھیں۔ مجاہدین کا حملہ اچانک تھا اور بے حد شدید۔ اس حملے میں سب سے بڑا جو ہتھیار استعمال ہو رہا تھا وہ آزادی کی تڑپ اور جذبۂ حریت تھا۔ اس جذبے کے زور سے مجاہدین نے اتنی بے جگری سے حملہ کیا کہ جنرل سلوسٹر بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے مارا گیا۔ چند ایک ہسپانوی افسر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈیڑھ دو سو سپاہی بھی بھاگ گئے۔ کیمپ میں جو رہ گئے وہ شدید زخمی تھے، ان کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی۔ باقی سب مارے گئے تھے۔ مجاہدین نے اسلحہ بارود اٹھایا اور اس جگہ جا چھپے جہاں وہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف منظم ہو رہے تھے۔

ون اردو ڈاٹ کام

یہ مراکش کے مجاہدین کا پہلا حملہ تھا۔ ان کا قائد ایک گمنام سا انسان تھا جو آگے چل کر عبدالکریم کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ فرانس اور سپین میں اس کے نام کے ساتھ دہشت وابستہ تھی۔ پہلی جنگِ عظیم سے چار سال پہلے فرانس محافظ فوج کی صورت میں مراکش میں داخل ہوا اور فریب کاری اور فوجی طاقت سے مراکش کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گیا۔ سپین نے بھی اسی قسم کی فریب کاری سے مراکش کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد فرانس نے الجزائر کے ساتھ ساتھ مراکش کو بھی اپنی نوآبادی بنا لیا اور وہاں فوج میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اس کے ساتھ مراکش میں فرانس اور دیگر یورپی ملکوں کے باشندوں کو آباد کرنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی اقدامات سپین نے بھی اپنے مقبوضہ حصے میں کئے۔ ان دونوں قوموں نے مراکشی مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مراکش اسلامی ملک کہلانے کے قابل نہ رہے۔

فرانسیسی فوج کا کمانڈر جنرل لائٹے تھا جو مانا ہوا چالباز تھا۔ اس نے مراکش کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے وہی چالیں چلیں جو انگریزوں نے برصغیر میں چلی تھیں۔ جنرل لائٹے نے مراکش کے ان سرکردہ مسلمانوں کو جو مختلف قبائل اور برادریوں کے سربراہ تھے، آپس میں ٹکرایا اور ان میں دشمنی پیدا کر کے قوم کا اتحاد ختم کیا۔ ان میں جو سربراہ طاقتور تھے انہیں مال و دولت اور جاگیریں دیں۔ اس طرح مراکش غلام ہو کے رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آزادی کی تڑپ مر گئی ہے لیکن زندہ قوموں کے افراد مر جاتے ہیں قومیں زندہ رہتی ہیں، قوموں کا ضمیر زندہ رہتا ہے جو ایک انسان کی صورت میں اٹھتا ہے۔

مراکش کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ یہ ایک سردار کا بیٹا تھا جو نوجوانی میں استعماریت سے آزادی کا نعرہ لے کے اُٹھا۔ اس کا نام عبدالکریم الخطابی تھا۔ باپ نے اسے قانون کی تعلیم دلائی۔ ڈگری لے کر بھی اُسے باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ وہ مسلمان تھا۔ وہ مراکش کے اُس حصے کا رہنے والا تھا جو سپین کے قبضے میں تھا۔ عبدالکریم کو قانون کی ڈگری کے باوجود یہ ملازمت ملی کہ وہ ہسپانوی فوجی افسروں کو بربر زبان پڑھانے لگا۔ وہاں بربر زبان بولی جاتی تھی۔ عبدالکریم کے

دل میں مراکش کی آزادی کا جذبہ اور غیر ملکی آقاؤں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی جسے وہ چھپا نہیں سکتا تھا۔ ایک روز وہ ہسپانوی افسروں کی کلاس کو سبق دے رہا تھا۔ کلاس میں ہسپانوی جنرل سلوسٹر بھی تھا۔ عبدالکریم نے ایک افسر کو سبق یاد نہ کرنے پر ڈانٹ دیا۔ جنرل سلوسٹر برداشت نہ کر سکا کہ ایک غلام اپنے آقا کو ڈانٹے۔ اُس نے عبدالکریم سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو ملازم سمجھے اور تمیز سے بات کرے۔

عبدالکریم نے پروا نہ کی کہ سلوسٹر جرنیل ہے۔ اُس نے اس ہسپانوی جرنیل سے کہا —— "اس سے زیادہ بدتمیزی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم اپنے استاد کو ڈانٹ رہے ہو؟"

جنرل سلوسٹر نے بدزبانی کی۔ عبدالکریم نے اُسے کہا —— "سنو، سپین کے افسرو! مراکش مسلمانوں کا ہے تمہارا نہیں۔ تمہیں ایک نہ ایک دن یہاں سے نکلنا ہو گا" —— اُس نے سبق ادھورا چھوڑا اور یہ کہہ کر کلاس سے نکل گیا —— "میں تمہاری نوکری پر لعنت بھیجتا ہوں!"

عبدالکریم گھر تک نہ پہنچ سکا۔ اُس نے جرنیل سے جو بات کہہ دی تھی وہ بغاوت کا جرم تھا۔ اُسے گرفتار کر لیا گیا اور بغیر مقدمے کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ قید کے ابھی بیس روز ہی گزرے تھے کہ صبح سویرے جیل خانے کے افسروں کو رپورٹ ملی کہ عبدالکریم فرار ہو گیا ہے۔ آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ رات کے وقت جیل خانے کی دیواریں کس طرح پھلانگ آیا تھا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ ذمہ دار وارڈروں اور سنتریوں کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ سراغ لگانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کس طرح جیل خانے سے نکلا تھا۔ ایک قیدی کا فرار کوئی ایسا اہم اور خطرناک واقعہ نہ تھا مگر تھوڑے عرصے بعد پتہ چلا کہ عبدالکریم معمولی قیدی نہ تھا اور فرار کا یہ واقعہ مراکش کی تاریخ کا ایک موڑ ہے۔

عبدالکریم کے متعلق اطلاع ملی کہ اُس نے ایک پہاڑی خطے میں حریت پسندوں کا ہیڈکوارٹر اور ٹریننگ کیمپ قائم کر دیا ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ پہاڑی خطہ کون سا ہے۔ عبدالکریم نے زمین دوز تحریک کو ایسے طریقے سے منظم کیا کہ تھوڑے

عرصے میں بے شمار مجاہدین اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ لوگوں کے جذبۂ ایثار اور حریت کے پیچھے وہ ظلم و تشدد بھی تھا جو فرانسیسی اور ہسپانوی حکمرانوں نے مراکشی مسلمانوں پر روا رکھا تھا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں وہاں کے عوام کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کرتی تھیں۔ مراکشی مجاہدین کی کمزوری یہ بھی تھی کہ ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ ان کا مقابلہ بیک وقت دو فوجوں سے تھا۔ ایک فرانسیسی اور دوسری ہسپانوی۔ فرانس نے ساری دنیا میں مشہور کر رکھا تھا کہ مراکش کے اصل حکمران مراکشی مسلمان ہیں، فرانس کی فوج تو ایک معاہدے کے تحت مراکشی حکومت کی حفاظت اور ان کی راہنمائی کے لئے یہاں موجود ہے کیونکہ بربر قبائل حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے سرکشی کرتے رہتے ہیں۔

اس جھوٹے پروپیگنڈے کے جواب کے لئے حریت پسندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پوری عیسائی دنیا ان کے خلاف تھی۔ فرانسیسی اور ہسپانوی مراکش والوں سے صلاح الدین ایوبی سے کھائی ہوئی شکستوں کا انتقام لے رہے تھے۔ عبدالکریم نے اپنی تنظیم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر رکھا تھا جس میں ایک شعبہ جاسوسی کا بھی تھا۔ ایک سال کے اندر اندر حریت پسندوں کی ایک فوج تیار ہو گئی مگر اس کمزوری کے ساتھ کہ اس کے پاس اسلحہ نہ تھا۔ لہٰذا پہلا مسئلہ اسلحہ کے حصول کا تھا جس کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ چھوٹی چھوٹی فوجی چوکیوں پر شب خون مارے جائیں۔ اس مقصد کے لئے جانیں قربان کرنے کی ضرورت تھی۔ مجاہدین یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے۔

ایک جاسوس نے عبدالکریم کی اطلاع دی کہ ہسپانوی جنرل سلویسٹر فلاں دن فلاں فوجی کیمپ کے معائنے کے لئے جا رہا ہے اور اس کیمپ کی نفری ایک ہزار کے قریب ہے جس کے پاس تمام تر جدید اسلحہ ہے۔ ایسی نفری پر دن دہاڑے حملہ کرنا خودکشی کے برابر تھا لیکن عبدالکریم نے جنرل سلویسٹر کا نام سُنا تو اُس کا خون جوش میں آگیا۔ یہ انتقام کا جوش تھا۔ اسی جرنیل نے عبدالکریم کو قید میں ڈالا تھا۔ اس مردِ مجاہد نے اپنے مجاہدین سے کہا کہ اگر وہ جرنیل کی موجودگی میں حملہ کریں اور صرف اس جرنیل کو ہی ہلاک کر دیں تو ہسپانوی حکومت کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔ مجاہدین تو اُس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ جان کی قربانی کو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔ وہ حملے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ عبدالکریم نے انہیں ٹریننگ ہی ایسی دی تھی کہ کم تعداد سے زیادہ تعداد کے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔

مقررہ دن اِدھر جنرل سلویسٹر فوجی کیمپ میں پہنچا اُدھر عبدالکریم کی قیادت میں مجاہدین کی مختصر سی نفری کیمپ کے قریب ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جنرل سلویسٹر نے کیمپ کا معائنہ شروع کیا ہی تھا کہ مجاہدین لاٹھیوں، برچھیوں، تلواروں اور خنجروں سے کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ فوج اس ناگہانی حملے سے بوکھلا اٹھی۔ اس نے دفاع میں لڑنے کی بہت کوشش کی لیکن مجاہدین نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ عبدالکریم جنرل سلویسٹر کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جنرل اپنے افسروں اور باڈی گارڈز کی حفاظت میں بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عبدالکریم نے اسے دیکھ لیا۔ افسروں اور باڈی گارڈز نے اس کے گرد حصار کھینچ لیا۔ انہوں نے گولیاں چلائیں، سنگینیں چلائیں، مجاہدین زخمی اور شہید ہوتے مگر عبدالکریم کی آواز گرج رہی تھی ——— "میں جنرل سلویسٹر کو زندہ یا مُردہ لے کے جاؤں گا۔"

یہ ایک حیرت انگیز معرکہ تھا۔ لاٹھیاں سنگینوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ اُدھر تجربہ کار فوجی اور فوج میں سے چُنے ہوئے باڈی گارڈز تھے۔ اِدھر غیر فوجی مجاہدین تھے جن کے پاس جذبہ اور نعرہ تکبیر تھا۔ اُنہوں نے لہولہان ہو کر حصار توڑ لیا۔ اُدھر سے کچھ مجاہدین مرے ہوتے ہسپانوی سپاہیوں کی رائفلیں لے کے پہنچ گئے۔ جرنیل کی حفاظتی دیوار ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ہسپانوی جرنیل اور عبدالکریم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ جرنیل جان کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ عبدالکریم نے انتقام کی آگ سے دیوانہ ہو کے کہا ——— "میں نے تمہیں کہا تھا کہ مراکش مسلمانوں کا ہے، تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا مگر تم نے جنگی طاقت کے نشے میں مجھے قید میں ڈال دیا۔"

"سنو عبدالکریم!" ——— جنرل سلویسٹر نے کہا ——— "تم ہماری جنگی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے اگر مار بھی ڈالو گے تو تم آزاد نہیں ہو سکتے۔ میرے قتل کی سزا مراکش کے ایک ایک مسلمان کو ملے گی۔ تمہارے پاس کوئی طاقت نہیں۔"

"ہماری طاقت ہمارا خدا اور ہمارا ایمان ہے" ——— عبدالکریم نے اُسے کہا ——— "اگر تمہارا خدا سچا ہے تو اُسے کہو کہ تمہیں میرے ہاتھ سے زندہ نکال لے۔"

جنرل سلویسٹر نے دھمکیوں کے بعد اسے لالچ دیئے۔ دوستی کا جھانسہ دیا۔ مراکش سے نکل جانے کا وعدہ کیا لیکن عبدالکریم نے اپنے مجاہدین سے کہا —— "مراکش کے ان تمام بے گناہ مسلمانوں کے قتل کا انتقام لو جو اس کافر کے حکم سے قتل ہوتے ہیں۔"

بیک وقت کئی برچھیاں اور تلواریں جنرل سلویسٹر کے جسم میں داخل ہو گئیں۔ اُس وقت تک میدان مجاہدین کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ کیمپ میں یہ خبر پھیل گئی کہ جرنیل مارا گیا ہے۔ ہسپانوی سپاہ کا رہا سہا دم خم بھی ٹوٹ گیا۔ کیمپ خون میں ڈوب چکا تھا۔ جذبہ جنگی قوت کر خون میں ڈوب چکا تھا۔ دشمن کی فوج نے راہِ فرار اختیار کی۔ کئی ایک سپاہی بھاگتے ہوئے مارے گئے۔ سلامت وہی رہے جو بھاگ گئے۔ مجاہدین نے اسلحہ بارود اور دیگر سامان سمیٹا۔ شہیدوں کی لاشیں اٹھائیں۔ اونٹوں کی ضرورت کیمپ سے ہی پوری کر لی گئی۔ وہاں خچریں اور گھوڑے بھی تھے۔ مجاہدین کے جانے کے بعد کیمپ میں لاشوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا۔ ہسپانوی فوج کے ہیڈکوارٹر کو اطلاع ملنے تک مجاہدین اپنے خفیہ کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ اسلحہ کی ضرورت پوری ہو چکی تھی۔

ہسپانوی مقبوضہ مراکش میں جگہ جگہ فوج کی چھوٹی بڑی چوکیاں تھیں۔ عبدالکریم کے مجاہدین نے رات کے وقت ان چوکیوں کے قریب جا کر اس قسم کے اعلان شروع کر دیتے —— "ہتھیار ڈال دو اور ہمارے پاس آجاؤ ورنہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے" —— ہر رات کسی نہ کسی چوکی کے ارد گرد یہ للکار سنائی دیتی تھی۔ صحرا کی خاموش رات میں یہ للکار خوف پیدا کرتی تھی جیسے یہ جنوں بھوتوں کی آوازیں ہوں۔ ہسپانوی فوج میں اتنے بڑے فوجی کیمپ پر مجاہدین کے حملے نے اور جنرل سلویسٹر کی موت نے دہشت پھیلا دی تھی۔ اس خبر کا اور مجاہدین کی للکار کا یہ اثر ہوا کہ رات کو ہسپانوی سپاہی وہ للکار سنتے اور صبح کی روشنی نمودار ہوتی تو وہ چوکی خالی کر کے بھاگ جاتے۔ اس طرح متعدد چوکیاں خالی ہو گئیں۔ بعض چوکیوں پر مجاہدین نے شب خون بھی مارے اور بہت نقصان کیا۔

عبدالکریم نے مجاہدین کی فوج منظم کر لی اور باقاعدہ پیش قدمی شروع کر دی۔ اب اس کا ہیڈکوارٹر ریف کی پہاڑیوں کے کہیں اندر تھا۔ اس نے میلیلا نام کے ایک بڑے شہر پر چڑھائی کی۔ اس شہر میں فرانسیسی، ہسپانوی اور یورپ کے دیگر ممالک کے باشندوں کی تعداد کم و بیش چالیس ہزار تھی۔ عبدالکریم نے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔ اس دوران مجاہدین نے جوشِ انتقام میں اس ارادے کا اظہار کیا کہ تمام یورپی باشندوں کو ہلاک کر کے ان کا مال اور دولت لے لی جائے جسے جنگِ آزادی میں استعمال کیا جائے۔ عبدالکریم نے انہیں کہا —— "میری نظر شہر پر ہے شہریوں پر نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کفار نے بے گناہ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا ہے اور آبروریزی تک سے گریز نہیں کیا۔ میں اس کے باوجود کسی شہری پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ یہ مردِ مجاہد کی شان کے خلاف ہے کہ کسی نہتے کا خون بہاتے۔"

مجاہدین بہت جذباتی ہوتے جا رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے عبدالکریم کی بات نہ سُنی اور یورپی باشندوں کے قتل کا ارادہ ترک نہ کیا۔ عبدالکریم نے یہ سوچ کر کہ شہر میں عورتیں بھی ہیں جو مجاہدین کے ایمان کو متزلزل کر سکتی ہیں اور مال و دولت بھی ہے جو ان کی نیت میں فتور پیدا کر سکتا ہے، اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور مجاہدین کو اپنے خفیہ کیمپ میں لے گیا۔ اس ایک ہی واقعہ سے عبدالکریم کے کردار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

کردار کی اسی عظمت کا کرشمہ تھا کہ ہسپانوی فوج کا ایک سارجنٹ کلیمس جو ہسپانوی نہیں تھا، یورپ کے کسی اور ملک کا رہنے والا تھا ایک روز چھپتا چھپاتا اُس پہاڑی علاقے میں پہنچ گیا جہاں مجاہدین نے اپنا کیمپ بنا رکھا تھا۔ اُسے اکیلے ہی گھومتا پھرتا دیکھ کر مجاہدین نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر یہی شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہسپانوی فوج کا جاسوس ہے۔ اس نے عبدالکریم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ مجاہدین کے ساتھ مل کر اپنی ہی فوج کے خلاف لڑنے آیا ہے۔ مجاہدین نے اس کی بات نہ مانی۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ انہیں اپنی جمعیت میں کوئی غدار نظر آتے یا دشمن کا کوئی جاسوس مل جاتے تو اسے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بالائی کمان سے حکم لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اسی رواج

کے تحت انہوں نے سارجنٹ کلیمس کے لئے گڑھا کھود لیا۔ اتفاق سے عبدالکریم کا کوئی قریبی آدمی اُدھر آ نکلا۔ اُس نے اس یورپی فوجی کی باتیں سُنیں تو محسوس کیا کہ اسے عبدالکریم کے پاس لے جانا چاہیئے۔ اگر یہ جاسوس ہے تو وہاں بھی اسے سزا دی جا سکتی ہے۔ اسے عبدالکریم کے سامنے لے جایا گیا۔

عبدالکریم کے سامنے جا کر اُس نے کہا —— "میری فوج یہاں کے مسلمانوں پر جو ظلم اور بربریت کر رہی ہے اس نے میرے ضمیر کو جگا دیا ہے۔ میں ننھے ننھے مسلمان بچوں کو ہسپانوی افسروں کی خدمت کرتے اور انہیں بھوکا رہتے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ جسے چاہتے ہیں گولی مار دیتے ہیں۔ معصوم لڑکیوں کو درندگی کا نشانہ بناتے ہیں۔ مسلمان کو وہ انسان نہیں سمجھتے۔ میں نے جو درندگی دیکھی ہے وہ تم لوگوں نے صرف سُنی ہے۔ یہ درندگی میرے ہاتھوں بھی کرائی گئی ہے میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا۔ میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیجتا رہتا ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس مذہب کے پیروکاروں میں انسان کی محبت نہیں وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں نے میلیلا سے محاصرہ اس لئے اٹھایا تھا کہ یورپی باشندوں کا قتلِ عام ہو گا جو تمہارے مذہب میں گناہ ہے۔ میں نے یہ سُنا اور اپنی فوج سے فرار ہو گیا۔ بہت مشکل سے پتہ چلایا کہ تم لوگ اس علاقے میں رہتے ہو۔ میں پاپیادہ یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں ضمیر سے گناہوں کا بوجھ اُتارنے آیا ہوں۔ مجھے وہ روشنی دکھا دو جو روح کو روشن کر دیتی ہے۔ اگر مجھے جاسوس سمجھ کر سزائے موت دینا چاہو تو مجھے مسلمان کر کے مارنا تاکہ میں خدا کے پاس ایک ایسے پاک انسان کی صورت میں جاؤں جس نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔"

اس کی باتیں اثر انگیز تھیں لیکن عبدالکریم جیسا ذہین کمانڈر یہ فیصلہ نہیں دے سکتا تھا کہ یہ شخص جاسوس نہیں ہے۔ اُسے فوری طور پر سزائے موت نہ دی گئی۔ عبدالکریم نے اسے اپنے ساتھ رکھا کیونکہ جاسوس نہ ہونے کی صورت میں وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ چند دنوں میں ہی یہ ثابت ہو گیا کہ وہ جاسوس نہیں۔ اُس نے ہسپانوی اور فرانسیسی فوج کی راز کی باتیں بتائیں اور فوج کی تنظیم

کے گُر بھی بتاتے۔ پھر اُس نے جاسوسی کی ڈیوٹی بھی اپنے ذمے لے لی۔ وہ ایسا صاحبِ کردار ثابت ہُوا کہ کیمپ میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ پھر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام عبدالکریم نے حج الامین رکھا۔ اس وقت تک بعض قبائل کے سردار بھی عبدالکریم کے جہاد میں شریک ہو چکے تھے۔ ان میں ایک سردار جہاد میں سب سے زیادہ حصہ لیتا تھا۔ اس کو حج الامین اتنا اچھا لگا کہ اسے اپنے گھر رکھ لیا۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ اس نے حج الامین کی شادی اپنی بیٹی کے ساتھ کر دی۔

ہسپانوی فوج نے اپنے سارجنٹ کلیمس کو پکڑنے کی بہت کوشش کی۔ جب پتہ چلا کہ وہ مجاہدین سے جا ملا ہے تو اسے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے پر انعام بھی مقرر کیا لیکن اسے کوئی نہ پکڑ سکا۔ وہ عبدالکریم کا دستِ راست ثابت ہُوا۔ اس وقت عبدالکریم غیر ممالک میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔ برطانیہ نے اسے دَر پردہ مدد پیش کی۔ جرمنی نے بھی ایسی ہی پیش کش کی لیکن اس نے کسی کی مدد قبول نہ کی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ ممالک مدد کے پردے میں اس کے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے صرف خدا پر اور اپنے جذبے پر بھروسہ کیا۔ اس نے مجاہدین میں سے ایسے آدمی الگ کر لئے جو ہنر مند تھے۔ اس نے انہیں دستی بم اور رائفلیں بنانے کو کہا۔ انہوں نے ان چیزوں کو غور سے دیکھا اور غاروں میں یہ چیزیں تیار کرنے لگے۔ مجاہدین یہ دیسی ساخت کا اسلحہ استعمال کرنے لگے، لیکن وہ زیادہ تر وہ اسلحہ استعمال کرتے تھے جو ہسپانوی فوج سے چھینتے تھے۔

مجاہدین میں یہ خوبی پیدا ہو گئی کہ وہ دشمن کا اسلحہ اور سامان دیکھ دیکھ کر اپنے گھروں میں ایسی ہی اشیاء بنانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ کسی سے مدد نہ مانگنی پڑے۔ عبدالکریم انہیں کہا کرتا تھا کہ تمہاری جو مدد کرے گا وہ کسی نہ کسی رنگ میں اس کا عوضانہ ضرور لے گا۔ ہو سکتا ہے اس عوضانے کے طور پر کوئی تمہارا جذبہ ہی تم سے لے لے۔ وہ مجاہدین کو اپنی مدد آپ کے سبق دیا کرتا تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ ایک لڑکے نے جس کی عمر چودہ سال تھی مجاہدین کے لئے ٹیلیفون کا نظام تیار کر دیا۔ مجاہدین نے دشمن کی مختلف چوکیوں اور فوجی قافلوں پر حملے کر کے جہاں اور بہت سا سامان حاصل کیا تھا وہاں فوجی ٹیلیفون اور بے شمار تار بھی ہاتھ آئے تھے۔

مجاہدین کے لئے یہ بیکار تھے کیونکہ وہ اس کا استعمال نہیں جانتے تھے۔ چودہ سال کی عمر کے ایک لڑکے نے اس سسٹم کو دیکھا۔ بیٹریوں کا انتظام کیا اور ضروری جگہوں پر ٹیلیفون سیٹ رکھ کر یہ سسٹم چلا لیا۔ اس سے عبدالکریم اور اس کے جانباز گروہ کو یہ سہولت حاصل ہو گئی کہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے رابطہ قائم ہو جاتا اور ضروری باتیں کر لی جاتیں۔ اس نظام کو متحرک بھی کر دیا گیا جہاں ضرورت ہوتی ٹیلیفون کا سسٹم بچھا لیا جاتا۔

مجاہدین کے حملے اور شب خون اتنے زیادہ اور شدید ہو گئے کہ ہسپانوی فوج کی چوکیاں جو شہروں سے دور تھیں خالی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر کی نفری ہلاک ہو گئی۔ دشمن کے لئے اپنے دور دراز کے دستوں تک رسد پہنچانا مشکل ہو گیا۔ مجاہدین راستے میں ہی لوٹ لیتے تھے۔ شہروں میں بھی ہسپانوی فوج کے لئے پاؤں جمانا مشکل ہو گیا۔ شہریوں نے بھی مجاہدین کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس کی صورت عدم تعاون اور سرکاری احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ کرتے کرتے مجاہدین نے یہ صورت پیدا کر دی کہ ہسپانوی راج عملاً ختم ہو گیا۔ احکام مجاہدین کے چلتے تھے۔ ہسپانوی برائے نام حاکم رہ گئے۔ یہ مجاہدین کی فتح تھی جو اتنی آسانی سے حاصل نہیں کی گئی جتنی آسانی سے بیان کر دی گئی ہے۔ ہزارہا مجاہدین نے جانیں قربان کیں۔ شب خون مارتے وقت کئی کئی مجاہدین شہید اور زخمی ہوتے تھے۔ ان میں بہت سے اعضاء سے محروم ہو گئے۔ مجاہدین میں کمسن لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں سے جو پکڑے جاتے تھے انہیں ایسی ایسی اذیتیں دی جاتیں جن سے گھبرا کر ایک کافر نے اپنا مذہب ہی ترک کر دیا تھا۔ ان کے گھر والوں کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔ گھر کے بچوں اور عورتوں کو بھی ذلیل کیا جاتا اور ان کے جسموں سے خون کا قطرہ قطرہ نکال کر انہیں مارا جاتا۔ مراکش کی ریت کے ذرے مجاہدین کے لہو سے لال ہو گئے۔ ہسپانوی سپاہیوں کی ہڈیاں ریگزار میں بکھر گئیں۔

استعماریت اپنے ہی خون میں ڈوب گئی۔ ہسپانوی مقبوضہ مراکش پر مجاہدین کا قبضہ تکمیل کے مراحل میں داخل ہو گیا۔

یہاں عبدالکریم نے ایک جنگی غلطی کی۔ اُسے چاہیئے تھا کہ اس حصّے پر

قبضہ مکمل کر کے اپنی باقاعدہ فوج بنا لیتا جس کی پشت پناہی کے لئے اپنی آزاد حکومت اور اپنی آزاد قوم ہوتی۔ ہسپانوی سپاہ کی پسپائیوں اور اپنی فتوحات سے اس کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ اس نے بعض حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ مجاہدین بھی جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے فرانسیسی فوج پر بھی حملے شروع کر دیئے۔ ان حملوں کی صورت شب خون جیسی تھی جو وہ فرانسیسی چوکیوں پر مارنے لگے۔ انہوں نے یہی طریقہ ہسپانوی فوج کے خلاف کامیابی سے آزمایا تھا۔ فرانسیسیوں نے ہسپانوی فوج کا حشر دیکھ کر پیش بندی کر رکھی تھی۔ ان کا جرنل لائٹے گھاگ جرنیل تھا۔ اس نے دفاع اور جوابی حملوں کے انتظامات کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی فوج کی نفری اور اسلحہ کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ مقبوضہ علاقہ بھی زیادہ تھا۔ اس کے برعکس مجاہدین کی نفری بھی کم، اسلحہ بھی کم، وسائل اور ذرائع محدود تھے۔

اس کے باوجود مجاہدین کا گوریلا آپریشن اتنا کامیاب ثابت ہُوا کہ فرانسیسیوں کو صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ متعدد چوکیاں ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ بعض جگہوں پر دُو بدُو مقابلہ ہُوا جس میں فرانسیسی سپاہی مجاہدین کے قہر اور غضب کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ جرنل لائٹے نے ان قبائلی سرداروں کو استعمال کرنا چاہا جنہیں اس نے انعام و اکرام اور جاگیریں دلوا کر اپنے ساتھ ملایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے قبائل مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ ایک سردار نے اپنے قبیلے سے کہا کہ وہ حکومت (فرانس) کا ساتھ دے۔ اُس نے مجاہدین کو رہزن اور ڈاکو کہا۔ دوسرے ہی دن اس کی لاش اس حالت میں ملی کہ ٹانگیں، بازو اور سر جسم سے الگ پڑے تھے۔ دوسرے تمام سرداروں کو نقاب پوش افراد نے صرف اتنا سا پیغام دیا —
”تم نے اپنے ایک ساتھی کا حشر دیکھ لیا ہے۔ اس کی ٹانگیں اور بازو اس وقت کاٹے گئے تھے جب وہ زندہ تھا۔ سر اُس وقت الگ کیا گیا تھا جب وہ مر چکا تھا“ —
اس کے بعد کسی سردار نے فرانسیسیوں کی حمایت اور مجاہدین کی مخالفت نہ کی۔

فرانسیسیوں نے جب یہ حال دیکھا تو انہوں نے سپین کی حکومت کو یہ تجویز بھیجی کہ مراکش پر قبضہ برقرار رکھنے اور باغیوں کی سرکوبی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ

فرانس اور سپین کی مشترکہ فوج بنائی جائے۔ سپین نے اپنے آپ کو شکستِ فاش سے بچانے کے لئے یہ تجویز فوراً مان لی اور فوراً ہی دونوں ملکوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ فرانس نے جنرل لاسٹے کو کمان سے سبکدوش کر کے مارشل پیٹن کو مراکش بھیجا۔ یہ بوڑھا مارشل جنگ کا اُستاد سمجھا جاتا تھا۔ سپین نے بھی اپنا مارشل بھیج دیا جس کا نام مارشل پریمو دی ریورا تھا۔ ان دونوں نے مشترکہ ہائی کمانڈ بنا ڈالی۔ دونوں ملکوں کی فوجوں کو یکجا کر لیا اور دونوں ملکوں نے ان کے لئے مزید فوج بھیج دی۔ اُس وقت طیارے بھی جنگ کے لئے استعمال ہونے لگے تھے۔ فرانس کے پاس طیارے تھے جو اس نے مراکش بھیج دیئے۔ ٹرک بھی بھیجے۔ طیارے اور توپیں مجاہدین کے لئے بہت ہی خطرناک اسلحہ تھا۔

مجاہدین نے دشمن کی اس تنظیم کے مطابق اپنی تنظیم کی اور کھلی جنگ کی تیاری کر لی۔ گوریلا اور کمانڈو اپریشن بھی جاری رکھا۔ ان کارروائیوں سے مجاہدین نے فرانسیسیوں کے رسد کے نظام کو بیکار کئے رکھا۔ دور دراز چوکیوں تک وہ سامان نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ دشمن نے رسد کے قافلوں کے ساتھ فوجی دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ مجاہدین نے ان پر بھی حملے کئے۔ خونریز معرکے لڑے اور دشمن کو بہت نقصان پہنچایا مگر فرانسیسیوں نے رسد کی حفاظت کے لئے جب طیارے بھیجنے شروع کئے تو مجاہدین کے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔ صحرا میں طیاروں سے اپنے آپ کو چھپائے رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ طیاروں نے رسد کی حفاظت کی جس سے فرانسیسیوں کی گرفت دُور دُور تک مضبوط ہو گئی۔

عبدالکریم نے اپنے حملوں کا انداز بدل دیا۔ فرانسیسیوں نے ایک دفاعی سلسلہ قائم کر رکھا تھا جس کی صورت چھوٹے اور درمیانہ درجے کے قلعوں کی سی تھی۔ ان کی تعداد چھیاسٹھ تھی۔ عبدالکریم نے ان پر حملے شروع کر دیئے۔ ۱۹۲۴ء کے آخر میں نو قلعوں پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ مشکل یہ تھی کہ مجاہدین کی نفری کم ہوتی جا رہی تھی اور اسلحہ بارود کی بھی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ ساز فیکٹری نہیں تھی۔ دشمن نے شہروں اور قصبوں میں جاسوسوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ کسی پر شک بھی ہوتا تھا کہ اس نے مجاہدین کی مدد کی ہے تو اس کے پورے خاندان کو پکڑ لیا

جاتا تھا۔ محاذ پر فرانسیسیوں کا ایک قلعہ مجاہدین کے ہاتھوں خالی ہوتا تھا تو شہروں میں مراکشی مسلمانوں کے کئی گھر حکومت کے ہاتھوں اُجڑ جاتے تھے۔ تاہم مجاہدین کے حوصلے بلند تھے۔ بے مائیگی کو وہ جذبے سے پورا کرتے تھے۔ عبدالکریم نے انسان دوستی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ اس کے پاس فرانس اور سپین کے بہت سے جنگی قیدی تھے۔ ان کے ساتھ اس کے حکم کے مطابق بڑا اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس نے ۱۹۲۵ء میں ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا بلکہ کشتیوں کا انتظام کر کے انہیں سمندر پار بھیج دیا۔ ان میں سے کئی ایک قیدی مسلمانوں کے سلوک سے اتنے متاثر ہوئے کہ گھروں کو واپس جانے کی بجائے مجاہدین کے ساتھ مل گئے اور ان کے دوش بدوش لڑنے لگے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں فرانس اور سپین کی مشترکہ ہائی کمان نے مجاہدین پر ایک فیصلہ کن حملہ کیا۔ اس حملے میں تمام تر توپ خانہ اور طیارے استعمال کئے گئے۔ جنگوں کی تاریخ میں اسے ایک ظالمانہ حملہ کہا گیا ہے۔ مجاہدین کے مورچوں اور کیمپوں پر طیاروں سے بے پناہ بمباری کی گئی۔ آبادیوں میں کہیں شک ہوا تو مکان جلا دیئے گئے۔ ہزاروں گھوڑ سوار اس حملے میں شریک تھے۔ مجاہدین نے بکھر کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے دشمن کو بھی چھوٹے چھوٹے دستوں میں بکھیرنا چاہا مگر دشمن نے اپنی ترتیب میں ردّوبدل نہ کیا۔ اندھا دُھند گولہ باری اور بمباری جاری رکھی۔ تاجروں کا کوئی قافلہ راستے میں آ گیا تو اسے بھی ختم کر دیا۔ کسی بے گناہ کو بھی نہ بخشا۔ مجاہدین کی نفری تیزی سے کم ہوتی گئی۔ ایمونیشن ختم ہو گیا اور وہ پھر تلواروں اور برچھیوں سے لڑنے لگے مگر آگ اور خون کے اس طوفان کے آگے نہ ٹھہر سکے۔

مجاہدین تو جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے مگر ان کی سزا شہریوں کو مل رہی تھی۔ ان کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ کہیں سے مدد لینے کی امید نہیں تھی۔ عبدالکریم نے شہریوں کو بچانے کے لئے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اور دشمن کے پاس اپنا ایک آدمی بھیجا۔ دشمن نے جنگ بندی سے انکار کر دیا عبدالکریم کے ساتھ اب بہت تھوڑے مجاہدین رہ گئے تھے۔ وہ بھی نہتے تھے۔ آخر اپریل ۱۹۲۶ء میں اس نے یہ اعلان کیا کہ مراکش کا خون صرف میری وجہ سے بہہ رہا ہے اور

خون ان کا بہہ رہا ہے جو لڑ نہیں سکتے اور جو لڑ سکتے تھے وہ لڑتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔ مراکش آزاد ہو کے رہے گا۔ میں نہ رہا تو میرے بعد ایک اور عبدالکریم اُٹھے گا۔ یہ اعلان کر کے وہ فرانسیسی اور ہسپانوی فوجی ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ وہ جب وہاں پہنچا تو اس کی بات سُنے بغیر اسے گرفتار کر لیا گیا، اسے اس کے اہل و عیال سمیت جلاوطن کر کے جزیرہ ری یونین بھیج دیا گیا۔

اس کی جلاوطنی سے آزادی کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کے روز مراکش آزاد ہو گیا۔ عبدالکریم آزاد مراکش میں داخل ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں مراکش کے پہلے انتخابات ہوئے اور اسی سال عبدالکریم اکیاسی برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔

* * *

بیوہ، بیٹا اور بھید

عرصہ بیس سال ہُوا، مجھ کو پولیس کی سروس سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ میں اُس وقت سب انسپکٹر تھا۔ مجھ کو بہت امید تھی کہ میں ایس پی کے عہدے تک نہ پہنچا تو ڈی۔ ایس۔ پی ضرور ہو جاؤں گا لیکن ایک ایسا پھڈا بن گیا کہ پہلے مجھ کو لائن حاضر کیا گیا، پھر معطل کر کے محکمانہ کارروائی ہوئی جس کے نتیجے میں مجھ کو سروس سے برطرف کر دیا گیا۔ میرے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں ہوئی، بے ایمانی میری اپنی تھی۔ اس کہانی کو آپ الگ رکھ دیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ میں آپ کو ایک اور کہانی سناتا ہوں۔

میں انگریزوں کے زمانے میں ڈائریکٹ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی ہُوا تھا جس کو اے۔ ایس۔ آئی کہتے ہیں۔ میں دیہات کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ میرے گاؤں میں اور گاؤں کے ارد گرد پرائمری سکول بھی نہیں تھا۔ وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ تعلیم کا رواج صرف بڑے شہروں میں تھا۔ میرے گاؤں سے پرائمری سکول والے گاؤں کا فاصلہ چار میل کے لگ بھگ تھا۔ اس سے دو میل آگے ایک بڑے گاؤں میں مڈل سکول تھا۔ میں یتیم لڑکا تھا۔ میرا باپ اُس وقت قتل ہو گیا تھا جب میری عمر سات آٹھ سال تھی۔ صرف ماں ہی ماں تھی اور میں اس بیوہ ماں کا اکیلا بیٹا تھا۔ ہمارے سر پہ ہاتھ رکھنے والا اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

ان حالات میں میں نے دس جماعتیں پاس کر کے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ آج کل ڈبل ایم۔ اے کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ میرے وقتوں میں جو لڑکا دس

جماعتیں پاس کر لیتا تھا، اُس کو لوگ حیران ہو کر دیکھتے تھے کہ اُس نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ روپے پیسے کے لحاظ سے میری ماں اس قابل نہیں تھی کہ مجھ کو چار جماعتیں بھی پڑھا سکتی۔ اگر مجھ کو خدا کی مدد حاصل نہ ہوتی تو میں آج اَن پڑھ کسان ہوتا اور بڑے زمینداروں کا مزارعہ ہوتا یا بٹائی پہ دوسروں کی زمینیں کاشت کرتا۔

میں نے یہ جو کہا ہے کہ مجھ کو خدائی مدد حاصل تھی، یہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ آپ لوگ کہیں گے کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو خود ہی بے ایمان کہہ چکا ہے، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں آپ لوگوں سے عرض کرتا ہوں کہ پہلے میری ساری کہانی پڑھ لیں، اس کے بعد مجھ پر فردِ جرم عائد کریں۔ ابھی مجھ کو مشتبہ سمجھیں۔

میرا باپ گاؤں میں خاندانی دشمنی کے سلسلے میں ایک لڑائی میں قتل ہو گیا تھا۔ گاؤں میں دونوں پارٹیوں کی لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف سے دو دو تین تین آدمی زخمی ہوئے اور میرا باپ مر گیا۔ یہ ایسی واردات نہیں تھی کہ ملزموں کا کھرا کھوج نہ ملتا۔ ملزم گاؤں میں ناچتے کودتے پھر رہے تھے۔ پولیس آئی اور تین آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی۔ سات آٹھ ماہ بعد میرے باپ کے قاتل صاف بری ہو کر گاؤں میں آ گئے۔ میری ماں مجھ کو سینے سے لگا کر روتی رہتی تھی۔ میرا باپ غریب آدمی تھا۔ زمین اتنی تھوڑی تھی کہ اس سے ہم کو پورے سال کا اناج نہیں ملتا تھا۔ باپ دوسروں کی اراضی بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ باپ قتل ہو گیا تو آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا۔ یہ مجھ کو بعد میں پتہ چلا تھا کہ گاؤں کے لوگوں نے میری ماں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن میری ماں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ مجھ کو یاد ہے کہ ماں نے میرے لئے ایک بکری رکھی ہوئی تھی جس کا وہ مجھ کو دودھ پلاتی تھی۔ ماں نے وہ بکری بیچ دی۔ مجھ کو یہ بھی پتہ چلا تھا کہ ہمیں دوسرے گھروں سے خیرات کے طور پر دانے اور دالیں ملتی تھیں۔

ایک صبح میں جاگا تو دیکھا کہ میری ماں صحن میں حیران اور پریشان کھڑی ہے۔ میں اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف پھیلایا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سکہ ایک روپے کا اور دوسرا آٹھ آنے کا تھا۔

میں یہ پیسے دیکھ کر بہت خوش ہُوا اور ماں سے پوچھا کہ یہ پیسے کس نے دیئے ہیں۔ ماں نے کہا کہ وہ اُٹھی تو صحن میں اُسے ایک روپیہ پڑا ہُوا نظر آیا۔ وہ یہ سکہ اٹھا کر چلی تو آگے اٹھنی پڑی ہوئی تھی۔

میں نے یہ سُنا تو میں صحن میں گھومنے پھرنے لگا کہ شاید اور پیسے مل جائیں۔ مجھ کو ایک اور اٹھنی مل گئی۔ ہم ماں بیٹا صحن میں مزید پیسوں کی تلاش میں پھرنے لگے لیکن اور کوئی پیسہ دھیلا نہ ملا۔ میں حیران تھا کہ میری ماں اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہے۔ میں اُس وقت بچہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ بچہ پیسے دیکھ کر کتنا خوش ہوتا ہے لیکن ماں خوش نہیں تھی۔ میں آپ کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ دو روپے آج کے دو روپے نہیں تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ کم از کم پچیس روپے تھے۔

چھ سات دن گزر گئے۔ ایک صبح میری ماں سو کر اُٹھی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ماں نے گھبرا کر کہا کہ وہ دیکھو، ایک روپیہ پڑا ہے۔ میں نے دوڑ کر وہ روپے کا سکہ اٹھا لیا۔ ماں نے پہلے سے زیادہ گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ــــ ”وہ دیکھو ایک اور پڑا ہے“ ــــ میں نے دوڑ کر وہ روپیہ بھی اُٹھا لیا اور میں سارے صحن میں دوڑتا پھرا کہ اور پیسے مل جائیں گے لیکن اور کچھ نہ ملا۔

پھر اس طرح ہوتا رہا کہ چھ سات دنوں بعد ہم جاگتے تو صحن میں کبھی ایک روپے کا سکہ، کبھی ایک روپیہ اور ایک اٹھنی، کبھی دو یا تین اٹھنیاں اور کبھی روپے کے دو سکے پڑے ملتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوتا تھا کہ میری ماں پریشان بھی تھی اور ڈری ہوئی بھی تھی۔ چھوٹی عید آئی تو اس سے دو تین روز پہلے روپے روپے کے پانچ سکے صحن میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ اُس زمانے میں نوٹ کم اور سکے زیادہ چلتے تھے۔

دو مہینے تک میری ماں نے کسی کو نہ بتایا۔ جب عید سے پہلے پانچ روپے صحن میں پڑے ملے تو میری ماں نے گاؤں کی دو عورتوں کے ساتھ ذکر کیا کہ چھ سات دنوں بعد ہمارے صحن میں ڈیڑھ دو روپے پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ ماں جب ان عورتوں کو بتا رہی تھی، اُس وقت میں موجود تھا۔

"یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی اتنا نیک انسان ہوگا جو تمہاری مدد کرنے کے لئے رات کو باہر سے پیسے پھینک جاتا ہو" ـــ ایک عورت نے کہا ـــ "اور سچی بات ہے، بُرا نہ جان لینا، تم کوئی پہنچ والی فقیرنی بھی نہیں ہو کہ خدا اس طرح تمہاری مدد کر رہا ہو۔"

"مجھ کو تو یہ سمجھ آئی ہے" ـــ دوسری عورت نے کہا ـــ "گاؤں کا کوئی لوفر لفنگا رات کو روپیہ اٹھنّی پھینک جاتا ہے۔ ایک روز وہ تمہارے سر آن چڑھے گا اور کہے گا کہ میں نے تم کو اتنی رقم کھلائی ہے ..... تم خود جانتی ہو مرد اکیلی اور بے آسرا عورت کو دیکھ کر کیا سوچتا اور کیا کیا کرتا ہے ..... بات ایک اور بھی ہے۔ خدا نے تم کو حسن دیا ہے اور تم جوان بھی ہو اور تمہارا بیٹا تم جیسا خوبصورت ہے۔ کوئی جنّ تم پر یا تمہارے بیٹے پر عاشق ہو گیا ہے اور یہ پیسے وہی پھینکتا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو یہ بڑے خطرے والی بات ہے" ـــ دوسری عورت نے کہا ـــ "جنّ اگر کھانے پینے کے لئے کچھ دیں یا کچھ رقم دیں تو وہ منحوس ہوتی ہے۔ سُنا ہے کہ جنوں کا دیا ہُوا کھانا گوبر اور اُن کے دیئے ہوئے پیسے ٹھیکریاں بن جاتے ہیں۔ کسی گھر میں پرانے زمانے کا چھپا ہُوا خزانہ ہو تو وہ بھی منحوس ہوتا ہے۔ اگر ایسا خزانہ نکال لیا جائے تو گھر پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے۔ مسجد کے مولوی صاحب سے پوچھو۔ وہ کتاب نکال کر تمہیں بتا دیں گے کہ یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں۔"

جنوں کا نام سن کر میں ڈر گیا۔ مجھ کو پتہ چل گیا کہ میری ماں پیسے دیکھ کر اتنی ڈری ہوئی کیوں تھی۔ مجھ کو دوسرا ڈر اس کا لگا کہ شاید کوئی لوفر لفنگا یعنی کوئی غنڈہ بدمعاش پیسے پھینک جاتا ہے اور ایک دن وہ میری ماں کو تنگ کرے گا۔ میری

میری ماں کو یہ باتیں پتہ چلتی تھیں تو وہ روتی تھی۔ وہ بیوہ عورت تھی۔ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کر سکتی تھی۔ گاؤں میں بات پھیل گئی کہ اس گھر میں روپے اور اٹھنّیاں گرتی ہیں تو گاؤں کے بزرگ ہمارے گھر آنے لگے۔ وہ میری ماں سے اس طرح سوال کرتے تھے جس طرح تھانیدار تفتیش کیا کرتے ہیں۔ آج کل سائنس دیہات میں پہنچ گئی ہے۔ دولت اور تعلیم بھی دیہات میں آ گئی ہے

پھر بھی لوگوں کا، تعلیم والے لوگوں کا بھی، یہ حال ہے کہ اُن کو کوئی واقعہ یا کوئی معاملہ سمجھ میں نہیں آتا تو کہتے ہیں کہ یہ جنوں اور چڑیلوں کا کام ہے۔ میں اُس وقت کا واقعہ سُنا رہا ہوں جب دیہات میں تعلیم نہیں گئی تھی۔ لوگ ہسٹریا اور مرگی کو جنوں کا قبضہ کہتے تھے۔ وہ ڈاکٹری علاج نہیں کراتے تھے۔

بزرگوں نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ یہ کسی جنّ کی کارروائی ہے۔ ایک بزرگ نے کہا تھا ـــ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سردری (میری ماں) کو اللہ پیری فقیری عطا کر رہا ہو۔"

میری ماں کو یہ سوال زیادہ پریشان کر رہا تھا کہ وہ اس رقم کو خرچ کرے یا پھینک دے یا گھر میں سنبھال کر رکھے۔ وہ رقم ایک ڈولی میں ڈال دیتی تھی۔

"ابھی خرچ نہ کرنا" ـــ نمبردار نے کہا ـــ "ہم کسی پہنچ والے کے ساتھ یا کسی سیانے کے ساتھ بات کریں گے۔"

گاؤں میں سب سے زیادہ بوڑھا آدمی ایک ریٹائرڈ صوبیدار تھا۔ اُس نے کہا کہ رات کو چھپ کر دیکھا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ جب سب سو جاتے ہیں تو کوئی آدمی پیسے پھینک جاتا ہے۔

ماں بہت خوبصورت عورت تھی۔ وہ جب بیوہ ہوئی تھی تو وہ اُس کا جوانی کا وقت تھا۔ مجھ کو پورا علم تو نہیں تھا کیونکہ میں ابھی بچہ تھا، جب میں جوان ہُوا تو مجھ کو خیال آیا تھا کہ میری ماں کو بعض لوگوں نے کس طرح تنگ کیا ہوگا۔ عورت غریب ہو اور خوبصورت ہو تو روپے پیسے والے آدمی اور غنڈے بدمعاش اُس پر جال پھینکتے ہیں۔

دو عورتوں کو پتہ چلا کہ اس گھر میں پیسے گرتے ہیں تو سارے گاؤں کو پتہ چل گیا۔ ہمارے گھر میں عورتوں کی قطار لگ گئی۔ ماں کو دن میں سو سو بار سنانا پڑتا کہ پیسے کس طرح گرتے ہیں۔ میں عورتوں کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ مجھ کو بہت ساری باتیں اُس وقت معلوم ہوتی تھیں جب میں بڑا ہو گیا تھا۔ میں آپ کو یہ ساری باتیں ساتھ ساتھ سُناتا جاتا ہوں۔ اس کا خیال نہ کریں کہ کون سی بات مجھ کو کب معلوم ہوتی تھی۔

ہر عورت اپنی اپنی رائے دیتی تھی۔ ان کی زیادہ تعداد یہ کہتی تھی کہ پیسے

کوئی جن پھینکتا ہے۔ دو تین عورتیں کہتی تھیں کہ میرا باپ بے گناہ مارا گیا تھا اس لیے خدا اس کو غیب سے مدد دے رہا ہے۔ یہی عورتیں ہمارے گھر سے باہر جا کر کچھ اور ہی باتیں کرتی تھیں۔ یہ باتیں کسی نہ کسی عورت کی زبانی میری ماں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کئی عورتیں باہر جا کر کہتی تھیں —— "جھوٹ بولتی ہے۔ اس کا (میری ماں کا) کوئی آشنا اس کو پیسے دے جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ غریب عورت ہے، یہ اتنے پیسے کہاں سے لاتی ہے۔ یہ پردہ ڈالنے کے لئے کہہ رہی ہے کہ اس کے گھر میں پیسے گرتے ہیں۔ کسی اور کے گھر میں اس طرح کبھی پیسے نہیں گرے۔"

بہت سی راتوں کو کئی آدمیوں نے باری باری جاگ کر ہمارے گھر کے سامنے اور پیچھے گلی میں اس طرح نظر رکھی کہ وہ کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔ چوکیدار نے بھی یہ ڈیوٹی دی مگر کسی کو کوئی ایسا آدمی نہ دکھائی دیا جس نے ہمارے گھر میں پیسے پھینکے ہوں۔ لوگوں نے یہ پہرہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ دیا۔ اس عرصے میں چار دفعہ ہمیں اپنے صحن سے پیسے ملے۔ رقم کبھی ایک روپیہ اور ایک اٹھنی ہوتی تھی اور کبھی دو روپے اور ایک بار چار اٹھنیاں ملی تھیں۔

میری ماں نے بھی یہ ڈیوٹی دی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی۔ اس طرح اس نے تین تین چار چار راتوں کے وقفے کے بعد ایک ایک رات جاگتے گزاری۔ ایک مہینے سے اُوپر عرصہ اُس نے ایسا کیا۔ دو دفعہ اس طرح ہُوا کہ روپے اور اٹھنیاں گریں۔ دونوں دفعہ ماں دوڑ کر باہر چلی گئی۔ پیچھے والی گلی میں بھی گئی لیکن اُس کو کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ تیسری دفعہ اس طرح ہُوا کہ ایک اور عورت ہمارے گھر میں میری ماں کے ساتھ جاگتی رہی۔ اتفاق سے اُس رات بھی پیسے گرے۔ دونوں دوڑتی ہوئی باہر گئیں۔ اُس رات دو آدمی بھی چھپ کر کہیں بیٹھے ہُوئے تھے۔ میری ماں اور دوسری عورت باہر نکلیں تو یہ دو آدمی اور چوکیدار بھی آ گیا۔ اِن سب نے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر دیکھا مگر انہیں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

اس طرح جاگنے سے میری ماں کو صرف یہ پتہ چلا کہ پیسے باہر سے آ کر گرتے ہیں۔ ماں نے پیسے گرنے کی آواز سُنی تھی۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ پیسے زمین

سے اُوپر آتے ہوں۔

چھ سات مہینے گزر گئے اور یہ پُراسرار سلسلہ ابھی تک چل رہا تھا۔ میری ماں نے پانچوں وقت نماز پڑھنی شروع کر دی۔ پھر اُس کو کسی نے دو تین وظیفے بتائے۔ اُس نے مصلّے پر بیٹھ کر تسبیح پر وظیفے پڑھنے شروع کر دیئے۔ گاؤں کی عورتوں نے اُس کو اس حالت میں دیکھا تو اُنہوں نے مشہور کر دیا کہ اس عورت کو فقیری مل گئی ہے اور اس کو غیب سے مالی امداد ملتی ہے۔ لوگ کسی فقیر کی یا شاید کسی ولی کی کہانی سنایا کرتے تھے کہ وہ جنگل میں جا کر مصلّے بچھاتا اور نماز پڑھا کرتا تھا۔ نماز کے بعد وہ مصلّے اٹھاتا تو اس کے نیچے ایک اشرفی پڑی ہوتی تھی۔ اُس کے دماغ میں یہ خیال آ گیا کہ یہاں خزانہ دفن ہے جس میں سے ایک اشرفی ہر نماز کے بعد اُس کو ملتی ہے۔ کیوں نہ ایک ہی بار سارا خزانہ نکال لیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ کدال ساتھ لے گیا اور وہاں سے زمین کھود ڈالی۔ اس کو کوئی خزانہ نہ ملا۔ اُس نے گڑھا بھر دیا اور اُس پر پہلے کی طرح نمازیں پڑھنے لگا مگر اس کو مصلّے کے نیچے سے اشرفیاں ملنی بند ہو گئیں۔

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ چھ سات مہینوں بعد ماں نے ڈبی میں سے رقم نکال کر گنی تو یہ ستانوے روپے آٹھ آنے تھی۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ نہیں دیکھا، وہ کہتے ہوں گے کہ یہ تو کوئی رقم ہی نہیں تھی، لیکن اُس زمانے کی یہ رقم آج کے دو ہزار روپوں کے برابر تھی۔ دیہات میں تو کوئی خرچ نہیں ہوتا اس لئے بھی یہ رقم ہمارے لئے ایک خزانہ تھا مگر ماں اس خزانے کو خرچ کرنے سے ڈرتی تھی۔

ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام صاحب بہت بوڑھے ہو گئے اور پانچ چھ مہینے پہلے وفات پا گئے تھے۔ اُن کا ایک جوان بیٹا تھا۔ اُس نے اپنے والد کی جگہ لے لی اور اب وہ امامت کرتا تھا۔ اُس کا اپنی ماں کے ساتھ سلوک اچھا نہیں تھا۔

وہ ماں باپ کا اکیلا بیٹا تھا۔ ماں اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اکیلا رہ گیا۔ اُس کے متعلق مشہور ہو گیا کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی علم ہے جس سے اس کو غیب کے بھید معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ عورتوں کے سر درد کا علاج دم کر کے کرتا تھا۔

ایک روز وہ ہمارے گھر آ گیا اور میری ماں سے پوچھا کہ پیسے کس طرح آتے

ہیں اور کیا ہوتا ہے۔ میری ماں نے اُس کو سارا حال احوال سُنا دیا۔ مولوی ہمارے گھر کے اندر گیا اور دیواروں اور چھتوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ ہمارے صحن میں ایک درخت نیم کا تھا، ایک شہتوت کا اور ایک بیری کا تھا۔ مولوی نے تینوں درختوں کے تنے دیکھے۔ تنوں کے پاس بیٹھ کر زمین پر ہاتھ پھیرا پھر ہر درخت کی شاخوں میں اس طرح دیکھتا رہا جیسے کسی پرندے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ وہاں سے ہٹ کر اُس نے میری ماں کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔

"یہ رقم خرچ نہ کرنا" — اُس نے کہا — "یہ بڑا بدمعاش جن ہے۔ اُس نے یہیں ڈیرے ڈال دیتے ہیں" — اُس نے اگلی بات سرگوشی میں کی لیکن میں نے سن لی۔ اُس نے میری ماں سے کہا — "تم بہت خوبصورت ہو۔ تمہاری آنکھوں میں خدا نے ایسی مستی ڈال دی ہے کہ یہ جن تمہارے گھر میں آ کر آباد ہو گیا ہے۔ تم سوتی ہوتی ہو تو یہ تمہاری آنکھوں کو چومتا ہے اور صحن میں کچھ رقم رکھ کر چلا جاتا ہے۔ اگر اس نے اپنا یہ سلسلہ جاری رکھا تو ایک دن تم بہت پریشان ہو گی۔ یہ تم کو اپنا غلام بنا لے گا، پھر تم کو اُس کی ہر خواہش پوری کرنی پڑے گی۔"

میں اتنا ڈر کر ماں سے لپٹ گیا۔ ماں بھی میری طرح ڈر گئی تھی۔ اُس نے مولوی سے پوچھا کہ اس جن سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مولوی نے میری ماں سے کہا کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد میرے گھر آ جانا۔

رات کو ماں جب مولوی کے گھر جانے لگی تو میں بھی اُس کے ساتھ چل پڑا۔ مولوی گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اُس نے کہا کہ بچے کو ساتھ نہ لایا کرو۔

"میں جن کو حاضر کروں گا تو بچہ ڈر کر بے ہوش ہو جائے گا" — مولوی نے کہا — "آج میں تم کو تعویذ دوں گا۔ یہ اپنے باہر والے دروازے کے ساتھ باندھ دینا۔ کل اسی وقت پھر آنا۔ بچے کو ساتھ نہ لانا۔ میں دو تعویذ اور دوں گا۔ ایک رات جن خود میرے پاس آ جائے گا۔ تم یہاں موجود ہو گی۔ وہ اپنی کوئی شرط بتلائے گا۔ وہ تم پوری کر دینا پھر وہ تمہارے گھر سے چلا جائے گا۔"

میری ماں نے کہا کہ اس نے کوئی ایسی شرط بتا دی جو میں پوری نہ کر سکوں تو پھر کیا ہو گا؟

"شرط مشکل نہیں ہو گی" — مولوی نے کہا — "جسم کی تھوڑی سی قربانی دے دینا.... اور ضروری کام یہ کرنا کہ کل تمام رقم ساتھ لے آنا۔"

میری ماں نے سر جھکا لیا لیکن مجھ کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ جسم کی قربانی کیا ہوتی ہے۔ میرے دل پر پہلے ہی جو ڈر بیٹھا ہوا تھا وہ اور زیادہ پکا ہو گیا۔ ماں وہاں سے آ گئی۔ رات کو ہی اُس نے دروازے کے ساتھ تعویذ باندھ دیا۔

دوسری رات میں سو گیا۔ صبح اُٹھ کر میں نے ماں سے پوچھا کہ وہ مولوی کے گھر گئی تھی؟ اُس نے بتایا کہ گئی تھی۔ میں نے وہ ڈولی دیکھی جس میں ماں روپے اور اٹھنیاں رکھتی تھی۔ ڈولی خالی تھی۔ مولوی نے ماں کو کہا تھا کہ ساری رقم ساتھ لے آنا۔ ماں رقم مولوی کو دے آئی تھی۔ ماں مزید تین راتیں مولوی کے گھر جاتی رہی۔ اس سے اگلے روز میں کھیلنے کے لئے باہر نکلا تو چار یا پانچ آدمی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میرے کانوں میں یہ بات پڑی کہ مولوی رات کو کہیں چلا گیا ہے۔ اُس نے صبح کی اذان بھی نہیں دی تھی۔ وہ نماز پڑھانے بھی نہیں آیا تھا۔ اُس کے گھر جا کر دیکھا۔ وہ گھر میں بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد مولوی گاؤں میں کبھی نظر نہ آیا۔ کئی لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی نے جن کو پکڑ لیا ہے لیکن مولوی لاپتہ ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ کوئی بڑا سخت جن ہے جس نے مولوی کو غائب کر دیا ہے۔

اِن دنوں میں ایک دفعہ دو روپے ہمارے صحن میں گرے۔ ایک روز گاؤں کے دو بزرگ ایک پیر کو ساتھ لے آئے۔ پیر نے بھی دم درود کیا اور دو تعویذ دے کر چلا گیا۔ اس کے بعد پیر نہ آیا۔ اُس کے تعویذوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پانچ چھ دنوں کے وقفے سے ہمارے صحن میں پیسے گرتے رہے۔

پندرہ سولہ دن گزر گئے۔ میں باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ایک آدمی جس کا لباس اور حلیہ فقیروں جیسا تھا، گاؤں میں آیا۔ گاؤں کے درمیان بڑ کا بہت پرانا درخت ہے۔ اس کے نیچے گاؤں کے پانچ چھ آدمی چارپائیوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ فقیر ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ بھیک مانگنے

والا کوئی فقیر تھا۔ اگر کوئی کہتا کہ یہ شخص پیر و مرشد ہے تو سب مان لیتے۔ اُس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ اُس نے گدڑی کی قسم کا چُغہ اوڑھا ہُوا تھا۔ کالی داڑھی دھلی دھلائی تھی۔ سر پر ململ کا صافہ بالکل سفید تھا اور اُس کے ہاتھ میں وہ عصا تھا جو عالم لوگ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ہم بچے دوڑ کر وہاں جا کھڑے ہوئے اور اس شخص کو دیکھنے لگے۔ اُس کے گلے میں پانچ چھ رنگ برنگی تسبیحاں لٹک رہی تھیں۔

”مجھے کسی نے بتایا ہے کہ یہاں کسی گھر میں پیسے گرتے ہیں یا شاید زمین سے نکلتے ہیں“ —— اُس نے کہا —— ”اگر مجھ کو اجازت مل جائے تو میں کچھ وقت اِس گھر میں گزار کر معلوم کر لوں گا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ کسی انسان کا کام نہیں۔“

”نہ جی!“ —— ہمارے ایک بزرگ نے کہا —— ”کسی انسان کا کام ہوتا تو وہ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ پیسے پھینکتا لیکن جناب، پانچویں چھٹے روز صبح صحن میں پیسے پڑے ملتے ہیں۔ عورت بے چاری بیوہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُس بے چاری کو نقصان نہ پہنچے۔ اُس کا ایک ہی بچہ ہے اور یہ عورت بڑی نیک اور بھاگوان ہے۔“

”مجھ کو کوئی لالچ نہیں“ —— اُس شخص نے کہا اور اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا —— ”میرا نام مقیم شاہ ہے۔ ایسے ہی گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ حضرت سلیمانؑ کی اُمت (جنات) کے ساتھ دوستانہ لگا رکھا ہے۔ مجھ کو کچھ نہیں چاہیئے۔“

دیہات کے لوگ اس قسم کے لوگوں سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ مقیم شاہ نے جو باتیں کیں اور جس لہجے میں کیں، اُن سے تو ہمارے بزرگ اور گاؤں کے سب آدمی اتنے متاثر ہوئے کہ پتہ چلتا تھا کہ اس کے پکے مُرید بن جائیں گے۔ وہ اُس کو ہمارے گھر لے گئے۔

میری ماں نے اُس کی خاطر تواضع کی اور مقیم شاہ نے اپنی گٹھڑی میں سے لوبان نکال کر جلایا اور ایک کمرے میں رکھ دیا۔ اُس نے پھر پھر کی طرح صحن میں تینوں درختوں کو دیکھا اور سر ہلایا۔ جس طرح پولیس کسی گھر کی تلاشی لیتی ہے اسی طرح مقیم شاہ نے سارے گھر میں گھوم پھر کر دیکھا اور دو تین جگہوں سے دیواروں کو سونگھا۔ آخر اُس نے اپنی گٹھڑی میں سے مصلّے نکالا اور کمرے میں ایک جگہ بچھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ اُس نے میری ماں کو کہا کہ ایک دِیا جلا کر کمرے میں کسی جگہ رکھ دو اور یہ دِیا دن رات جلتا رہے۔

مقیم شاہ کو بتا دیا گیا تھا کہ مسجد کے امام صاحب نے کوئی عمل شروع کیا تھا لیکن وہ لاپتہ ہو گئے ہیں۔ پیر صاحب کے متعلق بھی مقیم شاہ کو بتایا گیا کہ وہ صرف ایک بار آئے تھے پھر نہیں آئے۔

”کوئی نہیں آئے گا“ —— مجھ کو آج تک مقیم شاہ کے لفظ یاد ہیں۔ اُس نے کہا تھا —— ”یہاں کوئی نہیں ٹھہر سکے گا۔ یہ جنّ ایسا ہے جیسے گاؤں میں نمبردار یا علاقے میں تھانیدار ہوتا ہے۔ اگر اس سے پیچھا نہ چھڑایا گیا تو یہ اس عورت سے اپنی تمام رقم ایسے طریقے سے وصول کرے گا کہ یہ بے چاری ہڈیوں کا پنجر بن جائے گی۔“

میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ خوف سے میرا کیا حال ہو گیا تھا۔ میں زور زور سے رونے لگا۔ مقیم شاہ کے پاس دس بارہ آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ مقیم شاہ نے مجھ کو اپنے پاس بُلا کر گود میں بٹھا لیا اور کہا کہ مت ڈر بچے! جنّ کو ایسا قابو کروں گا کہ یہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

ایک بات اور سن لیں، جب مولوی بھاگ گیا تو وہ ساری رقم جو اُس نے میری ماں سے لی تھی، اُس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو روپے گرنے کی بجائے ہمارے صحن میں تین تین چار چار روپے گرنے لگے تھے۔

مقیم شاہ نے ہمارے کمرے میں ڈیرہ ڈال دیا۔ وہ تسبیح پر کچھ پڑھتا رہتا، دن میں تین چار دفعہ مصلّے سے اُٹھتا اور وہ پانی جو پیالے میں اُس کے پاس پڑا رہتا تھا، اس میں اُنگلیاں ڈبو ڈبو کر سارے گھر میں اندر اور باہر چھڑک دیتا تھا۔ وہ تین دن ہمارے گھر میں رہا۔ میں جلدی سو جاتا۔ رات کو بھی وہ شاید جاگتا تھا۔

وہ صبح کی اذان کے بعد تھوڑے وقت کے لئے باہر کھیتوں میں جایا کرتا تھا۔ چوتھے دن وہ صبح گھر سے روزمرّہ کی طرح نکلا پھر واپس نہ آیا۔ اس کے بعد وہ واپس آیا ہی نہیں۔ اُس کا مصلّے، اُس کی تسبیح اور اُس کی گٹھڑی ہمارے گھر میں

پڑی رہی۔ یہ گٹھڑی اور دوسری چیزیں آٹھ نو سال ہمارے گھر میں رہیں، پھر ایک روز میری ماں یہ تمام چیزیں برساتی نالے میں پھینک آئی تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ نالہ ایک روز خوب چڑھا ہوا تھا۔ ماں مقیم شاہ کی ساری چیزیں لے گئی اور ان کو سیلابی نالے میں بہا دیا۔

مقیم شاہ غائب ہو گیا تو میں نے اور ماں نے تو ڈرنا ہی تھا، سارا گاؤں ڈر گیا۔ اگر مقیم شاہ ویسے مایوس ہو کر چلا جاتا یا کچھ بتا کر جاتا تو اور بات تھی۔ اس سے پہلے مولوی اسی طرح غائب ہو گیا تھا اور اب مقیم شاہ اس طرح غائب ہوا کہ اپنی ضروری چیزیں بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ سب کہتے تھے کہ اس کو اور مولوی کو اسی جن نے بھگایا ہے۔ شاید اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ گاؤں کے بڑے آدمی اپنے پیر صاحب کے پاس جاتے تھے کہ وہ کچھ کریں تو پیر صاحب ایک تعویذ دے کر ٹال دیتے تھے۔

اگر میں آپ کو چھوٹی چھوٹی باتیں سناؤں تو یہ بہت لمبی کہانی بن جائے گی۔ مختصر بات یہ ہے کہ ہمارے صحن میں پہلے کی طرح روپے اور اٹھنی کے سکے گرتے رہتے تھے۔ میں ہر وقت ڈرتا رہتا تھا اور ماں پہلے سے زیادہ وظیفے پڑھنے لگی۔ وہ کوئی نماز قضا نہیں ہونے دیتی تھی۔ عبادت کا ماں پر یہ اثر ہوا کہ اس نے پیروں فقیروں کی طرح باتیں کرنی شروع کر دیں۔ عورتیں اب اس کی بہت ٹہل سیوا کرتی تھیں۔ وہ میری ماں سے اپنے لئے دعا کراتی تھیں۔ میری ماں بے چاری تو اس لئے اللہ کی عبادت کرتی رہتی تھی کہ کوئی مصیبت آ رہی ہے تو وہ ٹل جائے۔ ہمارے گھر کسی کسی دن ہانڈی نہیں پکتی تھی۔ دال سالن اور روٹی کوئی نہ کوئی عورت دے جاتی تھی۔ جمعرات کی شام کو تو ہمارے گھر میں کھیر اور حلوے کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ میری ماں سب کو منع کرتی تھی لیکن دیہاتیوں نے میری ماں کو پہنچی والی فقیرنی بنا دیا تھا۔

ایک روز ماں نے مجھ کو کہا کہ تم کو سکول داخل کراؤں گی۔ میں حیران ہو گیا کہ ماں کو یہ خیال کیوں آیا ہے، اور مجھ کو خوشی بھی ہوئی کہ میں سکول میں پڑھوں گا۔ اس سے اگلے دن گاؤں کے دو آدمی مجھ کو چار میل دور ایک بڑے گاؤں میں لے گئے جہاں پرائمری سکول ہوا کرتا تھا اور مجھ کو سکول داخل کرا دیا۔ سات آٹھ

سال عمر کے بچے کے لئے ہر روز اتنی دور سکول آنا جانا بہت مشکل تھا۔ میری ماں نے ایک ٹٹو رکھ لیا۔ زین گاؤں کے کسی آدمی نے دی تھی۔ میں ٹٹو پر اکیلا سکول جاتا اور آتا تھا۔ اس زمانے میں دیہات کے لڑکے سکول سے بھاگتے تھے لیکن میرے دل کو لکھائی پڑھائی اچھی لگتی تھی۔

میں اس کہانی کو اور زیادہ مختصر کر دیتا ہوں۔ میں نے چار جماعتیں پاس کر لیں۔ پھر مجھ کو اس کے اگلے گاؤں کے مڈل سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ مجھ کو تعلیم کا جو شوق تھا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے بڑے آرام سے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں۔ میں بڑے اچھے کپڑے پہن کر اسی ٹٹو پر سکول جایا کرتا تھا۔ اگر مجھ کو غیب سے مالی امداد نہ ہوتی تو میں بالکل ان پڑھ رہ جاتا۔ آٹھ سالوں کے دوران غیب کی یہ مالی امداد جاری رہی۔ پہلے کی طرح روپے اور اٹھنیاں صحن میں گرتی رہیں۔ مجھ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ اسی ماں نے جو پیسے خرچ کرنے سے ڈرتی تھی، مجھ پر یہ پیسے کیوں خرچ کرنے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ یہ پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کو ڈر کیوں نہیں لگتا۔

مجھ کو اپنی ماں کے لفظ ساری عمر یاد رہیں گے۔ اس نے کہا تھا —— "بیٹا! میں جس خدا کی عبادت کرتی ہوں اور جس خدا کے نام کے وظیفے پڑھتی ہوں، اس کی ذات کے سامنے کوئی جن بھوت نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نے خدا سے پوچھا تھا۔ خدا نے کسی طرح مجھ کو اشارہ دے دیا تھا کہ یہ رقم خرچ کر دے۔ میں نے سوچا کہ میں نے دنیا میں کونسی عیش کرنی ہے۔ ماں کے لئے سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کی زندگی سنوار دے۔ میں نے تم کو سکول میں داخل کرا دیا ہے۔"

میں نے جب آٹھ جماعتیں پاس کر لیں تو لوگ مجھ کو حیران ہو کر دیکھتے تھے کہ یہ لڑکا اتنا زیادہ پڑھ گیا ہے۔ ماں نے لوگوں کو اس سے بھی زیادہ حیران کر دیا۔ وہ اس طرح کہ اس نے گاؤں کے دو آدمیوں کی منت کی کہ وہ مجھ کو شہر لے جا کر نویں جماعت میں داخل کرا دیں اور ادھر ہی بورڈنگ ہاؤس میں میرے رہنے کا انتظام کر دیں۔ یہ دونوں آدمی مجھ کو شہر میں داخل کرانے کے لئے

لے گئے۔

وہ ایک اسلامیہ ہائی سکول تھا۔ ہیڈ ماسٹر بہت اچھا آدمی تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا باپ کیا کام کرتا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا باپ میرے بچپن میں مارا گیا تھا اور میں دوسروں کی امداد سے مڈل پاس کر کے اب ہائی سکول میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں نے ہیڈ ماسٹر کو یہ نہ بتایا کہ مجھ کو مالی امداد کس طرح ملتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ہیڈ ماسٹر یقین نہیں کرے گا۔ شہر کے لوگ دیہاتی لوگوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھ پر یہ مہربانی کی کہ میری ساری فیس معاف کر دی۔ میں پھر بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا۔ مجھ کو صرف بورڈنگ ہاؤس کا خرچہ دینا پڑتا تھا۔

خدا کی مدد سے یہ دو سال بھی گزر گئے۔ میں نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ وہ جو غیبی امداد ہمارے گھر میں گرتی تھی وہ پہلے کی طرح گرتی رہی۔ میری ماں پہلے سے زیادہ عبادت گزار ہو گئی تھی۔ اب اس کے خلاف کسی کی زبان سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔

میری عمر اب اُنیس بیس سال ہو گئی تھی۔ خدا مجھ پر اور میری ماں پر بہت ہی زیادہ مہربان تھا۔ میں نے اس کہانی کے شروع میں ایک بوڑھے پنشنر صوبیدار کا ذکر کیا ہے۔ اس کو فوت ہوتے تقریباً چھ سال گزر گئے تھے۔ اب اُس کا چھوٹا بھائی صوبیدار میجری پنشن لے کر گاؤں میں آ گیا تھا۔ اُس کے دل میں خدا نے اتنی اچھی بات ڈال دی کہ ایک روز وہ ہمارے گھر آیا۔ وہ میری ماں کے لئے ایک نیا دوپٹہ اور ایک نئی چادر لایا تھا۔ اُس نے میری ماں کو کہا کہ تمہارے بیٹے کو میں شہر لے جاؤں گا اور اس کو پولیس میں بھرتی کرا دوں گا۔ میری ماں یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی کہ میں تو اس بیٹے کے لئے زندہ ہوں۔ اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھ کر میری روح بھی خوش ہو جائے گی۔

دو تین دنوں بعد یہ ریٹائرڈ صوبیدار میجر مجھ کو تیس بتیس میل دُور اُس بڑے شہر میں لے گیا جہاں پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ اُس زمانے کے مطابق میرا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ جسم بھرا ہُوا تھا اور ماں کی بدولت خدا نے مجھے رنگ و روپ اور

شکل و صورت بہت اچھی دی تھی۔

صوبیدار میجر نے مجھ کو ایک انگریز آفیسر کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس افسر نے میرے ساتھ اُردو میں کچھ باتیں کیں اور وہ مجھ کو ایک انگریز ایس پی کے پاس لے گیا۔ ایس۔ پی نے حکم دیا کہ اس کو اچھی طرح دیکھ کر اور امتحان وغیرہ لے کر اس کو ڈائریکٹ اے۔ ایس۔ آئی رکھ لو۔

خدا نے مدد کی۔ میں پولیس کے سٹینڈرڈ پر پورا اُترا اور مجھ کو ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

خدا نے میری ماں کی دعائیں اور عبادت اس طرح قبول کی کہ میں ٹریننگ کا لمبا عرصہ بڑی اچھی طرح گزار کر اور اے۔ ایس۔ آئی بن کر گاؤں میں آیا۔ ماں جس طرح مجھے ملی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ خوش بھی ہوتی تھی اور اتنا روتی تھی کہ اُس کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ ماں نے مجھ کو پہلی خبر یہ سنائی کہ جس وقت میں ٹریننگ پر چلا گیا، اُس وقت کے بعد صحن میں پیسے گرنے بند ہو گئے۔ اُس کے بعد آج تک ہمارے گھر میں پیسے نہیں گرے۔ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ خدا نے مجھ کو چھوٹا سا تھانیدار بنانا تھا اور غیبی امداد اُس وقت تک کے لئے تھی۔ مجھ کو اس کا کوئی افسوس نہ ہُوا کہ یہ امداد بند ہو گئی ہے۔ میں نے ماں کو کہا کہ نمازیں اور وظیفے چھوڑ نہ دینا۔

میں ٹریننگ کے بعد کی چھٹی ختم کر کے واپس چلا گیا۔ کچھ عرصہ پولیس لائن میں گزرا۔ پھر مجھ کو اِدھر اُدھر کی ڈیوٹیاں دی گئیں اور چوتھے سال مجھ کو اُسی بڑے شہر میں جہاں میں بھرتی ہُوا تھا، ایک تھانے میں تعنیات کر دیا گیا۔ وہاں کا ایس ایچ او ایک مسلمان سب انسپکٹر تھا جو اٹک کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُس نے مجھ کو مسلمان ہونے کی وجہ سے بہت اچھی ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ میں نے ایک سال کے عرصے میں پولیس کی اور تھانے کی تمام اُونچ نیچ، نیکی بدی سیکھ لی

ایک رات ڈیوٹی کانسٹیبل دو جوان لڑکوں کو پکڑ کر تھانے لایا۔ دونوں دیہاتی تھے اور نشے میں تھے۔ اس حالت میں اُنھوں نے کسی کی عورت کو چھیڑا اور دنگا فساد کیا تھا۔ اُس رات ایس۔ ایچ۔ او ایک گاؤں میں ایک قتل کی تفتیش

پر گیا ہوا تھا۔ میں نے جب ان دونوں ملزموں کو دیکھا تو میرے تن بدن کو آگ لگ گئی۔ ان دونوں میں سے میں ایک کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ میرے اپنے گاؤں کا لڑکا تھا اور وہ میرے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ میں نے آپ کو شروع میں بتایا ہے کہ میرے باپ کا یہ قاتل صاف بری ہو کر گھر آ گیا تھا۔ اس لڑکے کے ساتھ جو دوسرا لڑکا تھا، اُس کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ ہمارے گاؤں سے چار ساڑھے چار میل دُور کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔

دونوں بڑے امیر زمینداروں کے بیٹے تھے۔ دونوں کے خاندانوں کو انگریزی حکومت کی طرف سے نہری علاقوں میں بہت ساری زمین ملی ہوئی تھی۔ اپنے گاؤں کے اِردگرد دونوں کی زمین بہت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ آپ ایسا سمجھ لیں کہ یہ لڑکے اُن خاندانوں کے تھے جن کے پاس ضائع کرنے کے لئے دولت ہوتی ہے۔ یہ دونوں لڑکے بگڑے ہوئے شہزادے تھے۔ دوسرے گاؤں کے لڑکے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اپنے گاؤں کے لڑکے کی بات سناؤں گا۔ میں کسی گاؤں کا اور کسی مرد اور عورت کا نام ظاہر نہیں کر رہا اس لئے میں اپنے گاؤں کے لڑکے کا بھی نام نہیں بتاؤں گا۔ کسی کو ناراض کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ شخص ابھی زندہ ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالےٰ اس کو اور لمبی عمر دے۔ اس کا میں فرضی نام سے کہانی میں ذکر کروں گا۔ فرضی نام رفیق سمجھ لیں۔

رفیق میری عمر کا تھا۔ میں نے سنایا ہے کہ وہ میرے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ اُس کو باپ کی جاگیر اور دولت نے بگاڑ دیا تھا۔ اپنے باپ کے قتل کے بعد میری اور اُس کی کبھی بول چال نہیں ہوتی تھی۔ وہ اگر بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا تو میں اُن کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ ہم اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ناراض رہ کر بڑے ہوئے۔

مجھ کو ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ وہ میں ضرور سناؤں گا۔ اُس وقت ہماری عمریں بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال ہو گئی تھیں۔ رفیق بچپن سے ہی شرارتی اور شیطان تھا۔ کھیلتے

کھیلتے بچوں کے ساتھ لڑنا شروع کر دیتا تھا۔ اُس کے سامنے کوئی بچہ بولتا نہیں تھا کیونکہ وہ بہت امیر کبیر لڑکا تھا۔ ایک روز ایسے ہوا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا تھا۔ میں اُس وقت سکول میں پڑھتا تھا۔ شاید میں چوتھی جماعت میں تھا۔ میں رفیق کے گھر کے سامنے گزرا تو اُس نے مجھ کو بہت بُرا طعنہ دیا۔ اُس نے کہا ــــ "اوتے! اپنے باپ کو قبر سے نکال لا اور اُسے کہہ کر اپنے قتل کا بدلہ لے"۔

یہ لفظ ابھی اُس نے پورے ہی کئے تھے کہ اس کا باپ اندر سے نکلا۔ اُس نے رفیق کے سارے لفظ شاید سُن لئے تھے۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور اپنے بیٹے کے مُنہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ رفیق چکر کھا کر گرا۔ باپ نے اُسے اُٹھا کر اس طرح مارا پیٹنا شروع کر دیا جیسے اُس کو جان سے مار دے گا۔ میں اتنا ڈرا کہ وہاں سے بھاگ کر اپنے گھر آیا۔

اُسی دن کا واقعہ ہے۔ میں بڑ کے درخت کے نیچے دو لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ رفیق کا باپ ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے بلایا۔ میں ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا کہ میرے بیٹے نے تم کو بہت بُری بات کہی تھی، میں نے اُس کو بہت مارا ہے۔ تم اُس سے ڈرا نہ کرو۔ جب کبھی ایسی بکواس کرے، پتھر اُٹھا کر اُس کے سر پر مار دو۔ میں تم کو کچھ نہیں کہوں گا۔

اس کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رفیق کا باپ بہت دیر میرے سر پر اور میرے مُنہ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ میرے دل میں اس شخص کے خلاف اتنی نفرت تھی کہ میں جب اس کو دیکھتا تھا تو آپ یقین مانیں کہ میرے دانت اس طرح بجنے لگتے تھے جس طرح سردی سے بجتے ہیں۔ اُس روز اُس نے اپنے بیٹے کو مارا پھر میرے ساتھ پیار کیا تو یہ نفرت ذرا کم ہو گئی۔ میں نے گھر جا کر اپنی ماں کو بتایا۔ ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔

میں آپ کو وہ بات سُنا رہا تھا کہ میرے تھانے کا ایک کانسٹیبل رفیق کو اور اُس کے دوست کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔ میں نے رفیق کے دوست کو حوالات

میں بند کر دیا اور رفیق کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"اب کہو تمہارے باپ نے میرے باپ کو قتل کیا تھا" — میں نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اب طعنہ دے کر دیکھو۔ تمہارا کوئی جرم ہے یا نہیں، میں تمہیں دس سال جیل دلواؤں گا۔"

میرے منہ میں جو بکواس آئی، وہ میں نے کر دی۔ میں وہ ساری باتیں نہیں سناتا جو میں نے اس کو کہی تھیں۔ اگر سنا دوں تو آپ کہیں گے کہ یہ شخص کتنا کمینہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے کمینوں کی طرح اسے بڑی گندی اور ذلیل باتیں کہیں۔

"دیکھ اوئے امان اللہ!" — اس نے مجھ کو کہا — "تم جیسے دس تھانیدار بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں نے اتنی زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا کہ میرا بازو کندھے تک دکھنے لگا۔ وہ نشے میں تھا اور بدمعاشیاں کر کر کے اس کے جسم میں اتنی جان نہیں رہی تھی جتنی میرے جسم میں تھی۔ میں نے اس کو بالکل اس طرح مارنا پیٹنا شروع کر دیا جس طرح بارہ تیرہ سال کی عمر میں اس کو اس کے باپ نے مارا پیٹا تھا۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا اور وہ ملزم نہ ہوتا تو میں اس کو جان سے مار دیتا۔ میں نے اس کو خود ہی حوالات میں بند کروا دیا کیونکہ مجھ کو اتنا غصہ آگیا تھا۔ تھوڑی دیر اور میرے سامنے ہوتا تو شاید میں اس کو جان سے ہی مار دیتا۔

میں نے محرر ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ ان دونوں لڑکوں کو میں بہت زیادہ سزا دلانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو بتایا کہ یہ میرے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے اور یہ لوگ کسی انسان کو انسان سمجھتے ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ جرم کوئی اتنا بڑا نہیں کہ گاؤں کے دو لڑکے شہر میں عیاشی اور بدمعاشی کرنے آتے تھے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ یہ شہر میں سینما دیکھنے اور طوائفوں کے بازار میں جانے کے لئے آتے ہیں۔

"کوئی مشکل نہیں جی" — محرر ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "جیسی الیف۔ آئی۔ آر کہیں گے ویسی ہی لکھ دوں گا اور اگر آپ کہیں تو میں آپ کے نام کی الیف۔ آئی۔ آر

لکھ دوں گا کہ آپ بسلسلہ گشت شہر گئے ہوئے تھے اور آپ نے ان لڑکوں کو ایک عورت پر دست درازی کرتے اور دو آدمیوں کو زد و کوب کرتے پکڑا ہے۔ ۳۰۷ آسانی سے لگ سکتی ہے۔"

میں نے یہ سوچا کہ میرا الیس۔ ایچ۔ او واپس آجاتے تو اس کے ساتھ صلاح مشورہ کروں گا۔ اس کو بتاؤں گا کہ میں رفیق کو زیادہ سے زیادہ سزا دلانا چاہتا ہوں۔ ایس۔ ایچ۔ او تجربہ کار سب انسپکٹر تھا اور ویسے بھی وہ مجھ کو بہت چاہتا تھا۔

الیف۔ آئی۔ آر فوراً تحریر ہونی چاہیئے تھی لیکن یہ ہمارے ہاتھ میں تھا کہ ہم دو تین روز بعد الیف۔ آئی۔ آر تحریر کر کے اس پر پیچھے کی تاریخ ڈال دیتے۔

دوسرے دن میں نے ایک کانسٹیبل کو رفیق کے باپ کو اطلاع دینے کے لئے بھیجا کہ تمہارا بیٹا حوالات میں بند ہے۔ میں نے دانستہ رفیق کے دوست کے گھر اطلاع نہ بھیجی۔ رفیق کا گاؤں میرا ہی گاؤں تھا جو اس شہر سے تیس بتیس میل دور تھا۔

رفیق کا باپ رات کے سات آٹھ بجے تھانے میں آگیا۔ میں اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ یہ شخص جو میرے باپ کا قاتل تھا چپ چاپ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کچھ وقت اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ میری زبان پر ایک ہی بار بہت سی باتیں اور بہت سی گالیاں آگئی تھیں۔ مجھ کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سی بات پہلے کروں۔

"امان بیٹا!" — رفیق کے باپ نے بڑی دبی ہوئی آواز میں پوچھا — "میرے بیٹے نے کیا جرم کیا ہے؟"

"یہ پوچھو کہ اس نے کیا جرم نہیں کیا" — میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا — "میں نے تمہیں اس لئے اطلاع کر دی ہے کہ اس کی ضمانت کا انتظام کر لو۔ میں نے تم پر یہ مہربانی اس لئے کی ہے کہ ایک بار تم نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے ساتھ بہت پیار کیا تھا" — یہ بات کہہ کر میرا غصہ اپنے آپ ہی بے قابو ہو گیا۔ میں نے کہا — "تم اپنی ساری جائیداد اور جاگیر بیچ ڈالو، میں تمہارے بیٹے کو ضمانت پر رہا نہیں ہونے دوں گا۔"

"ایک بوڑھے باپ پر رحم کر دو بیٹا!" — اُس نے کہا۔

"تم نے ایک معصوم بچے پر رحم نہیں کیا تھا" — میں نے کہا — "تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس بچے کا باپ قتل ہو گیا تو ان کا حال پوچھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ تم نے میری ماں کو جوانی میں بیوہ کر دیا تھا۔ گاؤں میں تمہاری حکومت تھی۔ آج تم جہاں کھڑے ہو، یہاں میری حکومت ہے۔"

"اتنا غرور نہ کر بچے!" — اُس نے کچھ طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ وہ آخر اُونچی حیثیت کا آدمی تھا۔ اُس نے کہا — "اگر اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا تو میرے بیٹے کو گاؤں میں قتل کر دیتے۔ تم نے اچھا کام نہیں کیا۔ میرے بیٹے کو تم نے سیر سپاٹا کرتے دیکھا تو اُسے پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ عزت دار مرد اس طرح نہیں کیا کرتے۔ تمہاری آنکھوں میں اتنی سی بھی شرم نہیں کہ ایک بوڑھے کو یہ کہو کہ بیٹھ جاؤ۔ گھر آئے دشمن کے ساتھ غیرت والے یہ سلوک نہیں کیا کرتے۔"

میرے منہ سے نکل گیا — "بیٹھ جاؤ۔ میں نے تمہیں بیٹھنے سے نہیں روکا.... میں نے تمہارے بیٹے کو بے گناہ نہیں پکڑا۔ اُس کا جُرم تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تھانیداری نے تمہارا دماغ صحیح نہیں رہنے دیا" — رفیق کے باپ نے کہا — "ایک طرف تو تم نے مجھ کو اس لئے اطلاع دی ہے کہ میں اپنے بیٹے کی ضمانت کا انتظام کر لوں۔ دوسری طرف تم تھانیداری کے رُعب میں آ کر یہ کہہ رہے ہو کہ تم اُسے ضمانت پر رہا نہیں ہونے دو گے۔"

اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ میرا دماغ صحیح نہیں رہا تھا۔ یہ انتقام کے جوش کا اور غصے کا اثر تھا۔ مجھ کو آج یاد آتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ میرے منہ سے کچھ باتیں ایسی نکل گئی تھیں جو گھٹیا لوگوں کے منہ سے نکلا کرتی ہیں۔ میں نے کہا — "ہاں، میں تھانیدار ہوں۔ تم کو میری تھانیداری اچھی نہیں لگی۔ میں تمہیں بتا دوں گا کہ تمہاری زمینداری اور دولت کیا کر سکتی ہے اور ایک تھانیدار کیا کر سکتا ہے۔ میں تم کو بھکاری بنا کر چھوڑوں گا۔"

"کیا تم اُس شخص کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کر دو گے جس نے تمہیں تھانیدار بنایا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"وہ شخص اگر میرے سامنے کسی کو قتل بھی کر دے تو میں اُسے صاف بچا لوں گا" — میں نے کہا — "تم جانتے ہو کہ پولیس میں مجھے کس نے بھرتی کروایا تھا۔"

"لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہیں دس جماعتیں کس نے پڑھائی ہیں" — رفیق کے باپ نے کہا۔

"خدا نے" — میں نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا — "اُس خدا کی ذات نہیں؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو امان!" — اُس نے کہا — "عزت دینے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن ایک بات زبان پر آ گئی ہے جو آج کہہ ہی دیتا ہوں" — اُس نے میری طرف جھک کر کہا — "اپنی ماں سے پوچھنا کہ تمہیں دس جماعتیں کس نے پاس کروائی ہیں۔ تمہاری ماں جھوٹ نہیں بولے گی۔"

اُس نے جب میری ماں کا نام لیا تو میری مٹھیاں بند ہو گئیں اور میرے دانت بجنے لگے۔ میرے دل میں آئی کہ میں نے جس طرح اس کے بیٹے کو مارا پیٹا تھا، اُسی طرح اس کی بھی ہڈی پسلی ایک کر دوں۔

"تم نے دوبارہ میری ماں کا نام لیا تو میں تمہیں بھی حوالات میں بند کر دوں گا" — میں نے غصے سے کہا۔

"مجھے حوالات میں بند کرنے سے پہلے اپنی ماں سے پوچھنا کہ میں اس شخص کو حوالات میں بند کر دوں؟" — اُس نے کہا۔

"کیا بکواس کرتے ہو؟" — میں نے دانت پیس کر کہا — "یہ تھانہ ہے، گاؤں نہیں جہاں تمہارا رُعب اور تمہارا حکم چلتا ہے۔"

"اتنا غصہ نہ کر امان!" — رفیق کے باپ نے بڑی دھیمی سی آواز میں کہا — "میں تیری ماں کے خلاف کوئی بُرا کلمہ نہیں کہوں گا۔ بڑی پاک عورت ہے۔ اُس کے چال چلن پر کوئی انگلی اٹھاتے تو میں اُس کی گردن کاٹ دوں گا۔

Scanned bv iqbalmt

میرے منہ سے جو بات نکل گئی ہے وہ میں اب اُگل نہیں سکتا۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ اگر میں راز کی بات بتا دیتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں احسان جتا رہا ہوں اور اگر بات دل میں رکھتا ہوں تو تم سوچتے رہو گے کہ معلوم نہیں اس شخص کے دل میں کیا ہے۔"

"تمہارا مجھ پر یہی احسان ہے کہ تم نے مجھے یتیم کیا تھا" —— میں نے کہا —— "تم اپنے بیٹے کو چھڑانے کے لئے معلوم نہیں اپنے دل میں کیسے کیسے جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ تم نے میرے ساتھ کون سی نیکی کی ہے؟"

"ہاں میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں" —— اُس نے کہا —— "لیکن میں نے کبھی بڑ نہیں ہانکی کہ میں نے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ تمہیں تمہارے باپ کے خون کی قیمت دے سکوں، اور میں دس سال قیمت دیتا رہا ہوں ... تم جب تھانیدار بن کر پہلی بار گاؤں میں آتے تھے تو تمہاری ماں کے علاوہ جو تمہیں دیکھ کر خوش ہُوا تھا وہ میں تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ آج میں نے اس لڑکے کے باپ کے خون کی قیمت دے دی ہے۔"

"کیسی قیمت؟" —— میں نے حیران ہو کر پوچھا —— "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"تمہارے گھر میں روپے اور اٹھنیاں کہاں سے آتی تھیں؟" —— اُس نے کہا —— "وہ سکے کوئی جن بھوت نہیں پھینکتا تھا۔ وہ میں پھینکا کرتا تھا"

مجھ کو بھلا کیسے یقین آ سکتا تھا۔ میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ بڑے سخت لہجے میں کچھ اور باتیں کیں، لیکن اُس کی باتیں مجھ پر اثر کر گئیں۔ اُس نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں اُس کی ساری بات سُنوں۔

"تمہارے باپ کے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں تھی" —— اُس نے کہا —— "وہ اپنے ایک دوست کی خاطر ہماری لڑائی میں شامل ہو گیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہماری ذات اور برادری کا خاندان تھا جس کے ساتھ ہماری دشمنی تھی۔ تمہاری ذات کچھ اور ہے۔ تمہارا باپ اکیلا دکیلا آدمی تھا اور غریب آدمی بھی تھا۔ اُس کی

بڑی گہری دوستی ہمارے دشمن خاندان کے ایک آدمی کے ساتھ تھی۔ اُس آدمی کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا۔ میرے خاندان کے دو آدمی لاٹھیاں اُٹھاتے آ گئے۔ میں گھر جا کر کلہاڑی لے آیا۔ وہ آدمی بھی کلہاڑی لے آیا۔ تمہارا باپ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کو تین آدمیوں کے مقابلے میں اکیلا دیکھ کر لاٹھی لے کر آ گیا۔ میں اُس کی تعریف کرتا ہوں کہ دوستی کا حق ادا کرنے آیا تھا ...

"تمہارا باپ اس آدمی کا دوست بھی تھا اور اس شخص کی زمین بھی بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ لڑائی ہوئی۔ میرا ایک رشتہ دار زخمی ہو گیا اور تمہارا باپ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ میں گرفتار ہُوا۔ مقدمہ چلا اور میں بری ہو گیا۔ جب میں بری ہو کر گاؤں میں آیا تو میں نے تمہاری ماں کو دیکھا۔ وہ میرے ہاتھ سے جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ مجھ کو اس پر بہت ترس آیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ اُس کا کوئی سہارا اور آسرا نہیں رہا۔ مجھ کو پتہ چلا کہ لوگوں نے اُس کو دوسری شادی کے لئے کہا لیکن وہ نہ مانی۔ تم بہت چھوٹے تھے۔ تم کوئی کام کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالنے کے قابل نہیں تھے ...

"اگر میرے ہاتھوں میرے دشمنوں کا بچّہ بچّہ قتل ہو جاتا تو مجھ کو ذرا سا بھی افسوس نہ ہوتا۔ تمہارے باپ کا معاملہ دوسرا تھا۔ اُس نے خواہ مخواہ ہماری لڑائی میں کود کر اپنی جان ضائع کر دی۔ میرے دل کو اُس کے مرنے کا اتنا رنج ہُوا کہ مجھ کو بے چینی لگ گئی۔ میں جب تم کو دیکھتا تھا اور جب میں تمہاری ماں کو دیکھتا تھا تو میرے دل کو معلوم نہیں کیا ہو جاتا تھا۔ میرے ماتھے پر تریلی آ جاتی تھی اور میں بیٹھ جاتا تھا کیونکہ اس حالت میں مجھ سے کھڑا نہیں ہُوا جاتا تھا۔ میری یہ حالت اس وجہ سے بھی اور زیادہ خراب ہو گئی کہ تمہارا گھر میرے گھر کے بالکل قریب ہے۔ تمہاری ماں بَین کرتی تھی تو اُس کی آواز میرے کانوں تک پہنچتی تھی۔ پہلے تو میں گرفتار ہو گیا تھا، پھر میں بری ہو کر آ گیا تو تمہاری ماں کبھی کبھی بَین کرتی تھی۔ میرے بری ہونے کا تمہاری ماں کو بہت افسوس تھا ...

"خدا کی قسم، میں ایک رات جب سارا گاؤں سویا ہُوا تھا، تمہارے باپ کی قبر پر چلا گیا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کے پاس بیٹھ کر میں نے تمہارے باپ سے معافی مانگی

اور میں روتا بھی رہا۔ اس سے مجھ کو تھوڑا سا اطمینان ملا لیکن دوسرے دن تم کو دیکھا تو میرے دل پہ پھر گھبراہٹ آگئی۔"

میں اس شخص کا بیان روک کر ایک بات کہوں گا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اُس پر مجھ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین نہ آنے کی وجہ یہ تھی یہ شخص امیر زمیندار تھا۔ ان لوگوں کے لئے کسی کو قتل کر دینا، کسی کمزور ذات کی عورت کی عزت برباد کر دینا کوئی جرم نہیں تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے کریں کہ سارا گاؤں گواہ تھا کہ اس شخص نے دن دیہاڑے میرے باپ کو قتل کر دیا تھا اور جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بری ہو گیا تھا۔ علاقے کا تھانیدار ہندو ہوتا، مسلمان ہوتا چاہے سکھ اور عیسائی ہوتا، وہ ان لوگوں کا غلام ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ سچے گواہوں کو توڑ کر جھوٹے گواہ عدالت میں کھڑے کر سکتے تھے۔ میں اس لئے حیران ہو رہا تھا کہ ایک غریب آدمی کو قتل کر کے اس کو اتنا افسوس کیوں ہو رہا تھا۔ نفسیات کا کوئی ڈاکٹر شاید اس مسئلے کو سمجھ سکے۔ میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ انسان اپنے آپ کو چاہے کتنا ہی پھنے خان سمجھے، وہ اندر سے کمزور ہوتا ہے اور جب کسی انسان کو پکڑتا ہے تو انسان کی ساری کمزوریاں اُبھر کر اُس کو شیر سے گیدڑ بنا دیتی ہیں۔

میری تعلیم اتنی زیادہ نہیں کہ فلسفے کے راز سمجھ سکوں۔ میں آپ کو کہانی سُنا رہا ہوں، آپ خود سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس شخص کو کیا ہو گیا تھا اور اس کے اندر یہ انقلاب کس طرح آیا تھا۔ اُس نے آگے جو بات سنائی اُس نے مجھ کو اور زیادہ حیران کر دیا۔

"میں کسی کو اپنی یہ حالت بتا نہیں سکتا تھا"— اُس نے کہا — "اگر بتاتا تو میری برادری والے مجھ کو بزدل اور بے غیرت کہتے۔ کوئی چیز مجھ کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ ایک رات میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تمہارے باپ کو خواب میں دیکھا۔ اُس نے مجھ کو ایک دو منٹ دیکھا اور غائب ہو گیا۔ میرا دل بہت گھبرایا۔ پھر مجھ کو نیند نہ آئی۔ میرے سامنے تم آگئے۔ ایک خیال مجھ کو آیا کہ تمہارا اور تمہاری ماں کا گزارہ کس طرح چلتا ہو گا۔ میرے گھر والے سوتے ہوتے تھے۔ میں ایک کمرے میں چلا گیا۔ کُرتے کی جیب سے دو روپے (سکے) نکالے اور صحن میں

آکر پورے زور سے تمہارے گھر کی طرف پھینک دیتے۔"

آپ نے دیہات کے مکان دیکھے ہوتے ہیں۔ صحن بہت کھلے ہوتے ہیں اور دیواریں زیادہ اُونچی نہیں ہوتیں۔ اس شخص نے جو روپے پھینکے تھے وہ ہمارے صحن میں گرے۔ اُس نے بتایا کہ پانچ چھ دنوں بعد اُس نے پھر دو روپے پھینکے۔ اس کو ابھی یقین نہیں تھا کہ پیسے ہمارے گھر تک پہنچ رہے ہیں یا نہیں۔ دو تین بار پھر پیسے ہمارے صحن میں گرے تو میری ماں نے دو عورتوں کو بتایا، پھر یہ بات گاؤں میں پھیل گئی۔ اس طرح اس شخص کو اطمینان ہو گیا کہ پیسے ہم تک پہنچ رہے ہیں۔

"اگر تم اتنے سخی تھے تو پیسے میری ماں کے ہاتھ میں کیوں نہ دیتے؟"— میں نے پوچھا۔

"وہ میرے مُنہ پر تھوک دیتی"— اُس نے کہا — "وہ میری امداد کبھی قبول نہ کرتی... اور سچی بات یہ ہے امان بیٹا! میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا تھا۔ میں اپنے دل کا حال کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ میں اکیلا پاگل ہوتا رہا۔ میں جانتا ہوں تم میری یہ بات نہیں مانو گے۔ نہ مانو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے اپنے اللہ کو راضی کیا ہے۔ میرا اللہ جانتا ہے۔"

اُس نے مجھے پورا پورا واقعہ سنایا کہ وہ پیسے رات کو اپنے گھر سے پھینکتا رہا تھا۔ یہ میں نے آپ کو سنا دیا ہے کہ ہمارے گھر میں کس طرح پیسے گرتے رہے۔

"پھر ایک مشکل پیدا ہو گئی"— اُس نے کہا — "مجھ کو پتہ چلا کہ تمہاری ماں ڈری ہوئی ہے اور لوگ اُس کو ڈراتے ہیں کہ یہ پیسے جن پھینکتے ہیں۔ میں نے جب یہ سُنا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ میں تمہاری ماں کو کس طرح بتاؤں کہ یہ پیسے جن نہیں پھینکتے، میں پھینکتا ہوں۔ اگر میں بتا دیتا تو دو نقصان ہوتے۔ ایک یہ کہ میری برادری کو پتہ چل جاتا اور یہ میرے لئے ٹھیک نہ ہوتا۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا کہ تمہاری ماں بدنام ہو جاتی۔ لوگ کہتے کہ تمہاری ماں کے ساتھ میرا اندرِ پردہ تعلق ہے... مجھ کو تمہاری ماں کی عزت کا ہر وقت خیال رہتا تھا...

"میں تم کو مولوی کا واقعہ سناتا ہوں۔ مجھ کو پتہ چلا کہ مولوی تمہارے

گھر گیا ہے۔ عورتوں کی زبانی میں نے سنا کہ مولوی نے تمہاری ماں کو کہا ہے کہ رات کو اُس کے گھر آئے۔ مولوی نے کہا تھا کہ یہ بڑا شیطان جن ہے جو پیسے صحن میں رکھ جاتا ہے۔ میں اس مولوی کو جانتا تھا۔ تم اُس وقت چھوٹے تھے۔ اس مولوی کا باپ صحیح مولوی اور امام تھا۔ اُس کے پاس علم تھا اور وہ لوگوں کو اُلٹے سیدھے راستے نہیں دکھاتا تھا۔ وہ مر گیا تو اُس کے اس بیٹے کو امامت مل گئی۔ یہ ابھی جوان تھا اور اس کا چلن اچھا نہیں تھا۔ دو غریب عورتوں کو یہ خراب کر چکا تھا۔ مجھ کو پتہ چلا کہ اُس نے تمہاری ماں کو رات کو اپنے گھر بلایا ہے تو مجھ کو آگ لگ گئی۔ میں تمہاری ماں کو نہیں روک سکتا تھا۔ وہ تو مجھ کو دیکھتی تھی تو اُس کے چہرے پر نفرت آجاتی تھی' ....

”مجھ کو معلوم نہ ہو سکا کہ تمہاری ماں مولوی کے گھر گئی ہے یا نہیں۔ میں نے پتہ لگا لیا۔ وہ گئی تھی اور رات کو پھر جائے گی۔ میں نے ٹوہ لگائی اور نظر رکھی۔ رات کو جب سب سو گئے تو تمہاری ماں کو میں نے گھر سے نکلتا دیکھا۔ وہ دوسری گلی میں سے آگے جا کر اُس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ رات کا وقت تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی آ بھی جاتا تو میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ کوئی میرے خلاف یا تمہاری ماں کے خلاف تہمت لگا کر تو دیکھتا ....

”تمہاری ماں مولوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ آگے میں کھڑا تھا۔ میں نے اُسے روک لیا۔ چاندنی میں اُس نے مجھ کو پہچان لیا۔ اُس نے کہا —— ’خونی۔ قاتل۔ مجھ کو تم نے بدکار سمجھ لیا ہے۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں‘ —— میں نے اُس کو بڑے آرام سے کہا —— ’میرے منہ پر ضرور تھوکو لیکن میری ایک یہ عرض مان لو کہ اپنے دل سے یہ وہم نکال دو کہ میں نے تم کو کسی بری نیت سے روکا ہے۔ میں تم کو اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں۔ دوسری عرض یہ ہے کہ مولوی کے گھر نہ جاؤ۔ وہ بدمعاش آدمی ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اُس کے پاس کوئی علم نہیں‘ ....

”تمہاری ماں نہیں مان رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے گھر میں کوئی جن پیسے نہیں پھینک رہا۔ جہاں کہیں سے بھی پیسے آتے ہیں تم خرچ کرو اور کسی سے مت ڈرو۔ اُس نے کہا —— ’تم تو چاہتے ہو کہ مجھ کو نقصان پہنچے۔ تمہارے دل

میں میری کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟‘ —— اُس نے میری بات نہ مانی اور مولوی کے گھر کی طرف چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہ گیا اور میں سوچتا رہا کہ اس عورت کو میں اس مولوی سے کس طرح بچاؤں ....

”میں نے ایک راستہ سوچا کہ مولوی صاحب کو ڈراؤں گا اور اس کو کہوں گا کہ اس عورت سے اپنا خیال ہٹا لے۔ یہ تو مجھ کو پتہ تھا کہ جن پیسے نہیں پھینکتے۔ مولوی فریب کاری کر رہا تھا۔ میرے اندر کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہاں سے میں نے اِدھر اُدھر ہونے کا خیال ہی نہ کیا ....

”کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مجھ کو تمہاری ماں بہت تیز تیز چلتی ہوئی آتی نظر آئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میرے پاس رُکے گی لیکن میرے قریب آ کر وہ آہستہ ہو گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے میرے قریب سے گزری، پھر رُک گئی۔ میں خاموشی کے ساتھ اُس کو دیکھتا رہا۔ اُس نے کہا —— ’تم نے ٹھیک کہا تھا‘ —— میں نے اُس کے قریب ہو کر پوچھا —— ’کیوں کیا ہوا؟‘ —— اُس نے کہا —— ’میں پہلے بھی اُس کے پاس آئی تھی۔ یہ مجھ کو سامنے بٹھا کر میری آنکھوں میں پھونکیں مارتا رہا۔ آج میں اس کے پاس آئی تو وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر اُس نے اشارہ کیا کہ میں اُس کے پاس بیٹھ جاؤں۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھ کو بازوؤں میں لے کر چارپائی پر لٹا لیا۔ پھر اُس نے تمہاری بات سچی کر دی کہ وہ بدمعاش آدمی ہے۔ خدا نے مجھ کو ایسی طاقت دی کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کو زور سے دھکا دیا تو وہ چارپائی سے نیچے جا پڑا۔ میں اُٹھ کر باہر نکلنے لگی تو اُس نے دوڑ کر مجھے پکڑ لیا۔ میں نے پہلے کی طرح زور لگا کر اُس کو دھکا دیا تو وہ دروازے سے لگا اور گر پڑا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ اب اُس کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی‘ —— تمہاری ماں نے مجھ کو یہ بھی بتایا کہ اُس وقت جو پیسے گھر میں گرے تھے وہ سارے مولوی نے اپنے پاس رکھ لئے ہیں ....

”میں نے اُس کو کہا کہ میں تم کو خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنی بہن کہتا ہوں۔ میرے دل میں تمہاری ہمدردی نہ ہوتی تو میں خوش ہوتا کہ تم خراب ہوتی رہو۔ تم کو معلوم نہیں کہ مجھ کو تمہاری عزت کا کتنا خیال ہے۔ میں نے منہ میں آئی بات روک

لی اور اُس کو نہ بتایا کہ پیسے میں پھینکتا ہوں۔ میں نے اُس کو کہا کہ تم کو خدائی مدد مل رہی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو تم سے بہت محبت ہے۔ تم نماز اور روزہ رکھا کرو اور ہر وقت اپنے اللہ کو یاد کرو۔ تم پر کوئی مصیبت آئی تو میں موجود ہوں۔ میں تمہارے بلاتے بغیر پہنچوں گا....

"میں نے اُس کو یہ بھی کہا — 'مولوی نے تمہاری عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تم گھر چلی جاؤ۔ میری ایک اور عرض مان لو۔ اگر مولوی کے ساتھ میری گڑبڑ ہو جاتے یا مولوی میرے ہاتھوں قتل ہو جاتے تو خدا کے لیے کسی کو نہ بتانا کہ رات کو میری اور تمہاری ملاقات ہوتی تھی' اور میں نے یہ لفظ کہے تھے — 'تمہاری ماں نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ میں کسی کا خون نہ کروں۔ میں نے اُس کو کہا کہ تم کو جو بُری آنکھ سے دیکھے گا، وہ زمین کے تختے پر نہیں رہے گا....

"میں نے یہ دیکھا کہ تمہاری ماں کا میرے خلاف جو غصّہ تھا وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کو کہا کہ تم یہ پیسے اپنے اُوپر اور اپنے بچّے کے اُوپر خرچ کرتی رہو۔ تمہاری ماں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ پیسے تم تو نہیں پھینکتے؟ میں نے انکار کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ تم یہی سمجھ کر یہ پیسے خرچ کرتی رہو کہ یہ میں پھینکتا ہوں۔ میں تم کو یہ ضرور کہوں گا کہ کسی بھی وقت تم کو رقم کی کپڑوں کی ضرورت پڑے تو مجھ کو اشارہ کر دینا....

"پھر ہمارے درمیان ایک دو باتیں ایسی ہوئیں کہ تمہاری ماں کا دل نرم پڑ گیا۔ میں نے اُس کی منّت کی اور کہا کہ مجھ کو اپنا بھائی سمجھتی ہو تو اپنے خاوند کا خون بخش دو۔ وہ کچھ نہ بولی.... اماں بیٹا! میری تمام دلیری اور میرا رُعب ختم ہو گیا۔ میں بیٹھ گیا اور اُس کے دوپٹے کا کونہ پکڑ کر اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا۔ پھر معلوم نہیں یہ کس طرح ہوا کہ میں اس طرح رونے لگا جس طرح دودھ پیتا بچہ بھوک سے روتا ہے۔ تمہاری ماں نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا — 'اگر تم نے سچّے دل سے مجھ کو اپنی بہن کہا ہے تو جاؤ میں تم کو اپنے بچّے کے باپ کا خون معاف کرتی ہوں' — چلتے چلتے اُس نے یہ بھی کہا — 'لیکن میں تمہاری کوئی مدد قبول نہیں کروں گی' — یہ کہہ کر وہ چلی گئی....

"میں سیدھا مولوی کے گھر گیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ چلی گئی ہے؟ تمہارے جال میں نہیں پھنسی؟ مولوی نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اُس کو کہا — 'میں کوئی زیادہ بات نہیں کروں گا نہ تمہاری بات سُنوں گا۔ میری بات غور سے سُن لو۔ صبح کی اذان تم نہیں دو گے۔ اُس وقت سے پہلے اس گاؤں سے نکل جاؤ۔ اگر تم نہ نکلے تو یہاں سے تمہاری لاش نکلے گی۔ تم نے ایک بیوہ عورت کی عزّت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تم جانتے ہو میں قاتل ہو کر بری ہو گیا تھا۔ تم کو اس طرح قتل کروں گا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا' — مولوی کانپنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کی زبان ہتھیانے لگی تھی۔ میں نے اُس کو پھر کہا کہ گاؤں سے نکل جاؤ.... وہ مجھ کو جانتا تھا۔ اُس میں اتنی جرأت اور ہمت نہیں تھی کہ میری بات پر دھیان نہ دیتا۔ مجھ کو یاد آگیا کہ تمہاری ماں نے بتایا تھا کہ اُس سے ساری رقم مولوی نے لے لی تھی۔ میں نے مولوی کو کہا کہ وہ تمام رقم میرے حوالے کر دے۔ اُس نے ٹرنک میں سے رقم نکال کر مجھ کو دے دی۔ تم کو یاد ہو گا کہ جب مولوی غائب ہو گیا تھا تو اُس کے بعد تمہارے گھر میں کچھ عرصہ ڈیڑھ دو روپے کی بجائے چار چار اور پانچ پانچ گرتے رہے تھے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ رقم جو مولوی لے گیا تھا، وہ تمہارے گھر جا کر تمہاری ماں کے حوالے کر دیتا۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ رقم تھوڑی تھوڑی کر کے پھینکتا رہا....

"میں اپنے گھر چلا گیا۔ صبح گاؤں والوں نے اذان نہ سُنی اور سویر ہو گئی۔ میں نے جا کر دیکھا۔ مولوی اپنے گھر کا سامان بھی پھینک کر چلا گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے تم جھوٹ بول رہے ہو" — میں نے رفیق کے باپ سے کہا — "تم نے اسے قتل کر کے لاش کہیں گم کر دی ہو گی۔"

"اگر وہ گاؤں سے نہ جاتا تو ایسا ہی ہوتا جیسا تم کہتے ہو" — اُس نے کہا — اس واقعہ کے تین چار سال بعد مجھ کو پتہ چلا تھا کہ وہ فلاں گاؤں میں ہے اور وہاں بھی امامت کرتا ہے۔ وہ گاؤں ہمارے گاؤں سے دس بارہ میل دُور ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ اگر تمہیں شک ہے تو وہاں جا کر اُس سے پوچھ لینا۔"

اس شخص نے جب مجھے اتنی زیادہ باتیں سُنا دیں تو میرا دل کہنے لگا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ جھوٹ نہیں ہوسکتا۔

"تم کو یاد ہوگا کہ ایک درویش سا آدمی اپنے آپ ہی آگیا تھا اور اُس نے تمہارے گھر میں ڈیرے ڈال دیتے تھے" — رفیق کا باپ کہہ رہا تھا — "معلوم نہیں مجھ کو کس طرح شک ہوگیا تھا کہ یہ شخص بھی دھوکہ باز ہے۔ میں نے سُنا تھا کہ اس نے بھی کہا ہے کہ پیسے جِنّ پھینکتا ہے۔ اصل حقیقت تو صرف مجھ کو معلوم تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ صبح سویرے تمہارے گھر سے نکلتا اور سیر سپاٹا کر کے واپس جاتا تھا۔ وہ جب تیسری صبح باہر نکلا تو کھیتوں میں موجود تھا۔ میں اس کے انتظار میں باہر نکل گیا تھا۔ میں نے اُس کو روک لیا اور کہا — 'تم جو کچھ بھی ہو، مجھ کو پروا نہیں۔ یہاں سے واپس اُس گھر میں نہ جانا۔ جاؤ گے تو پھر اس گاؤں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ میں جانتا ہوں، کہ کوئی ایسا جِنّ نہیں جو اُس گھر میں پیسے پھینکتا ہو' — اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ عورت تمہاری کیا لگتی ہے۔ میں نے اُس کو صاف کہا کہ میں اس عورت کے خاوند کا قاتل ہوں۔ وہ ہنس پڑا اور اُس نے کہا — 'پھر تمہیں کیا؟ میرا کام بن جانے دو۔ پھر ایک رات تم کو بھی عیش موج کرا دوں گا' — میں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے ابھی عیش موج نہیں کی؟ اس نے کہا — 'ابھی نہیں۔ عورت چال چلن کی بڑی پکی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس کو نرم کر لیا ہے' — اُس کے مُنہ سے یہی الفاظ نکلے تھے کہ غصے سے میرا جسم کانپنے لگا۔ میں نے اُس کو کہا کہ یہ عورت میری بہن ہے۔ اگر تم یہاں سے واپس نہ گئے تو تمہیں گاؤں کے درمیان کھڑا کر کے سارے گاؤں سے پتھر مرواؤں گا اور تمہاری لاش نالے میں پھنکوا دوں گا۔ اس نے کہا کہ مصلّیٰ اور تسبیح وغیرہ گھر پڑے ہیں۔ میں نے اس کو کہا کہ وہ اپنی جان اپنے ساتھ لے کر اِدھر سے ہی غائب ہوجائے ۔۔۔۔ اور وہ غائب ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ کوئی اُستاد نوسر باز تھا۔"

اس کے بعد رفیق کے باپ نے مجھ کو چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں یاد دلائیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی تھیں جو میرا خیال تھا کہ اس کو معلوم نہیں ہوں گی۔ بات اتنی

لمبی ہوگئی تھی کہ بیٹھے بیٹھے آدھی رات سے اُوپر کا وقت ہوگیا۔

"تمہارے گھر میں پیسے پھینکنے سے اور ان دو آدمیوں کو گاؤں سے بھگا دینے سے مجھ کو یہ فائدہ ہُوا کہ میرے دل پر جو گھبراہٹ اور جسم کے اندر جو بے چینی رہتی تھی، وہ ختم ہوگئی" — اُس نے کہا — "اب مجھ کو یہ سوچ پریشان کرنے لگی کہ تمہارا کیا بنے گا۔ یہ شاید خدا نے میرے دل میں ڈالی تھی کہ تم کو سکول میں داخل ہونا چاہیئے۔ خدا نے میری مدد اس طرح کی کہ ایک روز تمہاری ماں مجھ کو کھیتوں میں ایسی جگہ مل گئی جہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُس کو بتایا کہ جس طرح مولوی کو گاؤں سے نکالا اسی طرح اس آدمی کو بھی بھگا دیا ہے جس نے تمہارے گھر میں آ ڈیرہ جمایا تھا۔ تمہاری ماں نے کہا کہ یہ تم نے اچھا کیا ہے۔ یہ آدمی بھی بُری نیّت والا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے تمہاری ماں کو کہا کہ اپنے بھائی کا یہ مشورہ مان لو کہ اپنے بیٹے کو سکول میں داخل کرا دو۔ میں نے تمہاری ماں کو یہ بھی کہا کہ میں تم سے ملنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کروں گا۔ موقع ملے گا تو وہی بات کروں گا جو تمہارے فائدے کی ہوگی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ تمہاری ماں نے میری نیّت کو سمجھ لیا تھا۔ اُس نے تم کو داخل کرا دیا۔ تم ٹٹو پر سکول جایا کرتے تھے۔ تم کو یہی بتایا گیا ہوگا کہ یہ ٹٹو تمہاری ماں نے خریدا تھا۔ اپنی ماں سے پوچھنا کہ اُسے یہ ٹٹو کس نے دیا تھا۔ یہ میں نے خرید کر دیا تھا۔ خدا کی ذات کے سوا اس بھید کو اور کوئی نہیں جانتا۔

"پھر تم نے دس جماعتیں پاس کرلیں۔ وہ صوبیدار میجر جو تم کو پولیس میں بھرتی کرانے کے لئے لے گیا تھا، وہ ابھی گاؤں میں موجود ہے۔ اُس سے پوچھنا کہ اُس کو کس نے کہا تھا کہ اس لڑکے کو کہیں نوکر کرا دو ۔۔۔ آج تم ایک تھانے میں تھانیدار لگے ہوتے ہو۔ میرا بیٹا واقعی بدمعاش ہے۔ میں آخر اس کا باپ ہوں۔ میں تم سے صرف یہ عرض کروں گا کہ اُس سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ نہ لینا۔ اُس کا جتنا جُرم ہے اتنی ہی سزا دلانا۔"

"اگر میری ماں نے تم کو میرے باپ کا خون بخش دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں بدلہ لینے والا!" — میں نے کہا — "میں آج انگریز کا نہیں، تمہارا حکم مانوں گا۔ حکم کرو تو میں رفیق کو اور اُس کے دوست کو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ دونوں کو ساتھ

لے جاؤ۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر یہ آنسو بہنے لگے۔ میں نے محرّر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ دونوں لڑکوں کو حوالات سے نکال دو۔ وہ اُٹھا۔ میں بھی اُٹھ کھڑا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا اور میرا ماتھا چوم کر چلا گیا۔ دونوں لڑکے میری طرف دیکھے بغیر اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

تقریباً ایک مہینے بعد میں دو دنوں کے لئے اپنے گاؤں گیا اور یہ ساری بات ماں کو سنائی۔ ماں نے کہا کہ ایک ایک لفظ سچ ہے۔

"مجھ کو پہلے ہی شک تھا کہ پیسے یہی شخص پھینک رہا ہے" —— ماں نے کہا —— "پیسے گرنے اُس وقت بند ہوتے تھے جب تمہاری تنخواہ لگ گئی تھی۔ میری عزّت اگر محفوظ رہی ہے تو وہ صرف اس شخص کی وجہ سے رہی ہے۔"

اس واقع کے دس گیارہ سال بعد کا ذکر ہے۔ میں سب انسپکٹر بن چکا تھا اور ایک قصبے کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ ایک روز چار یا پانچ معزّز آدمی ایک درویش قسم کے آدمی کو پکڑ کر تھانے لائے۔ اب پاکستان بن چکا تھا اور نوٹ دُگنے کرنے کا کمال شروع ہو گیا تھا۔ اس درویش کو لوگوں نے نوٹ دُگنے کرنے کے سلسلے میں موقع پر پکڑ لیا تھا۔ درویش کی آدھی داڑھی سفید تھی۔ میں نے جب اُس کو غور سے دیکھا تو اس طرح لگا کہ یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کب سے یہ کام کر رہا ہے۔ اُس نے مجھ کو چکر دینے کی کوشش کی۔ جب اُس نے بات کی تو مجھ کو آواز بھی ایسی لگی جیسے میں نے یہ آواز پہلے بھی کبھی سُنی ہے۔ میں نے اپنے گاؤں کا نام لے کر اُس کو بیس سال پہلے کا وقت یاد کرا کے پوچھا کہ کیا وہ ایک بیوہ عورت کے گھر دو دن رہا تھا؟ اُس بیوہ کے گھر میں جِنّ پیسے پھینکتے تھے۔

وہ فوراً تو نہ مانا لیکن رات کو جب میں نے پولیس والوں کی طرح دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس سے تفتیش کی تو اُس نے اقبالِ جرم کر لیا کہ وہ بڑا پرانا نوسر باز ہے اور وہ میری ماں کے ساتھ بھی نوسر بازی کرنے پہنچ گیا تھا۔ اس کو ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرتے اتفاق سے پتہ چلا تھا کہ یہاں یہ واقعہ ہو رہا ہے۔ میں نے اُس کو بتایا کہ وہ بیوہ میری ماں تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ بھاگ کر کیوں

چلا گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ گاؤں کے ایک بڑے آدمی نے اُس کو بھگایا تھا۔

اس شخص کو میں نے سات سال سزائے قید دلائی اور اس سے کچھ عرصہ بعد میں پولیس سے سبکدوش ہو گیا۔

* * *